سعادت حسن منٹو

چغد

سعادت حسن منٹو
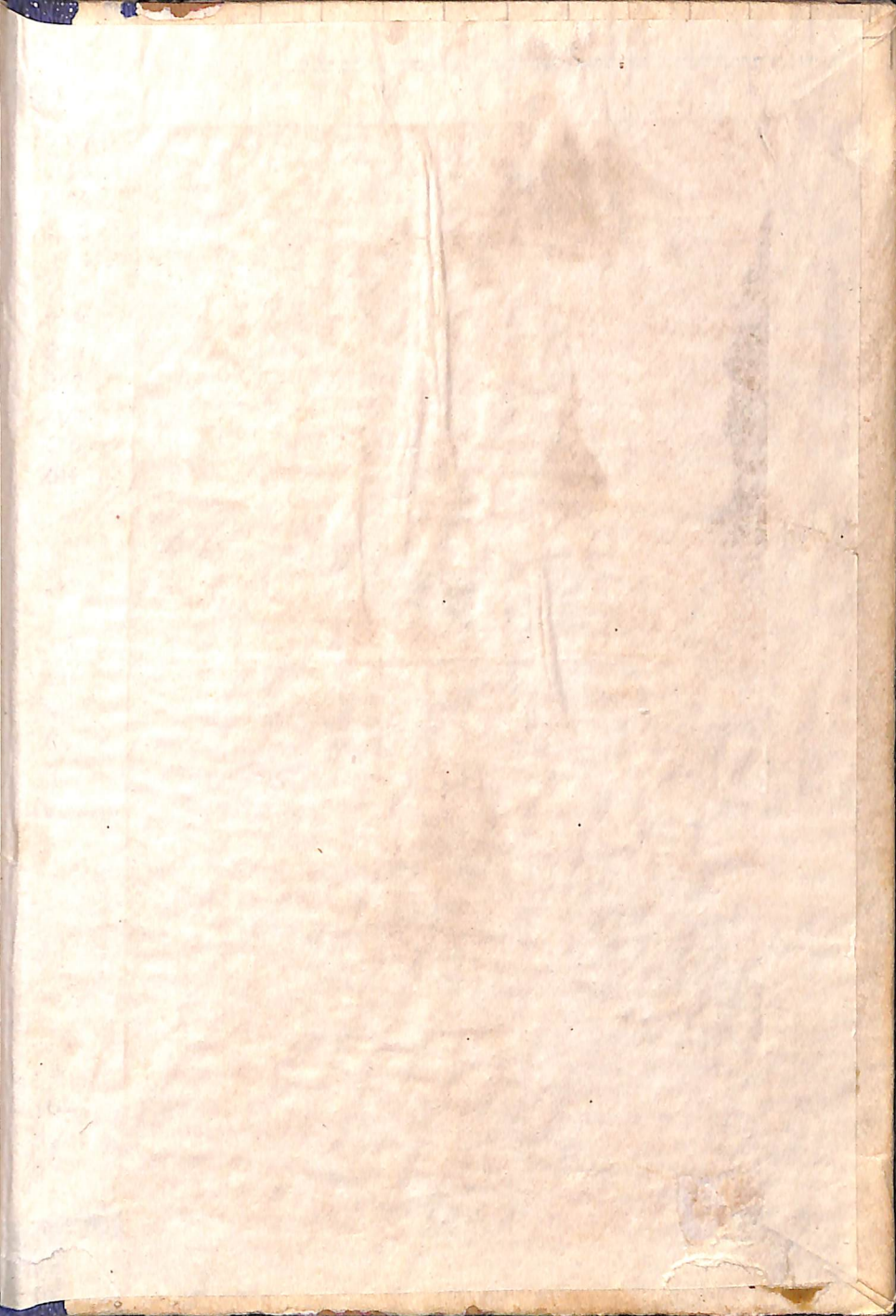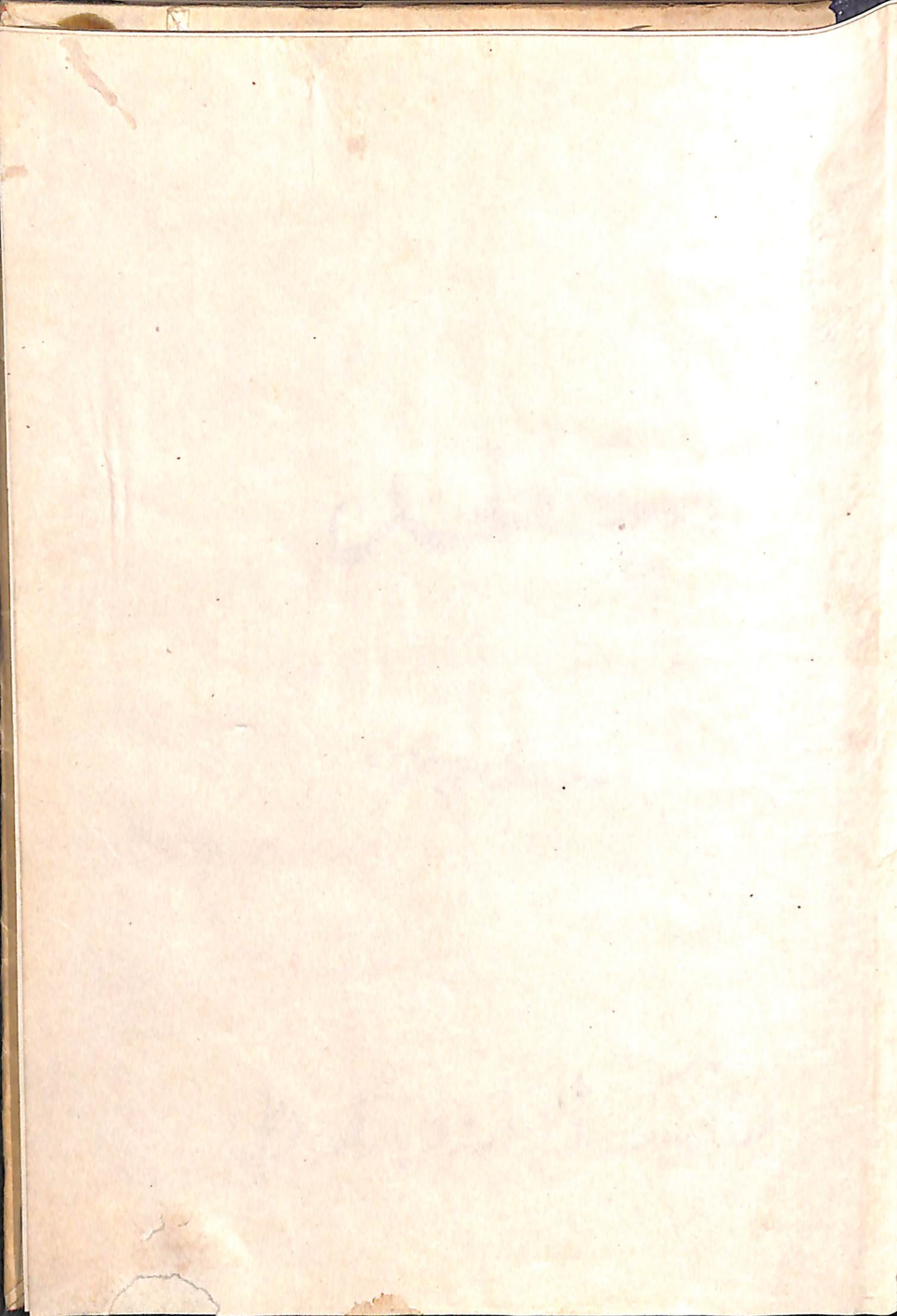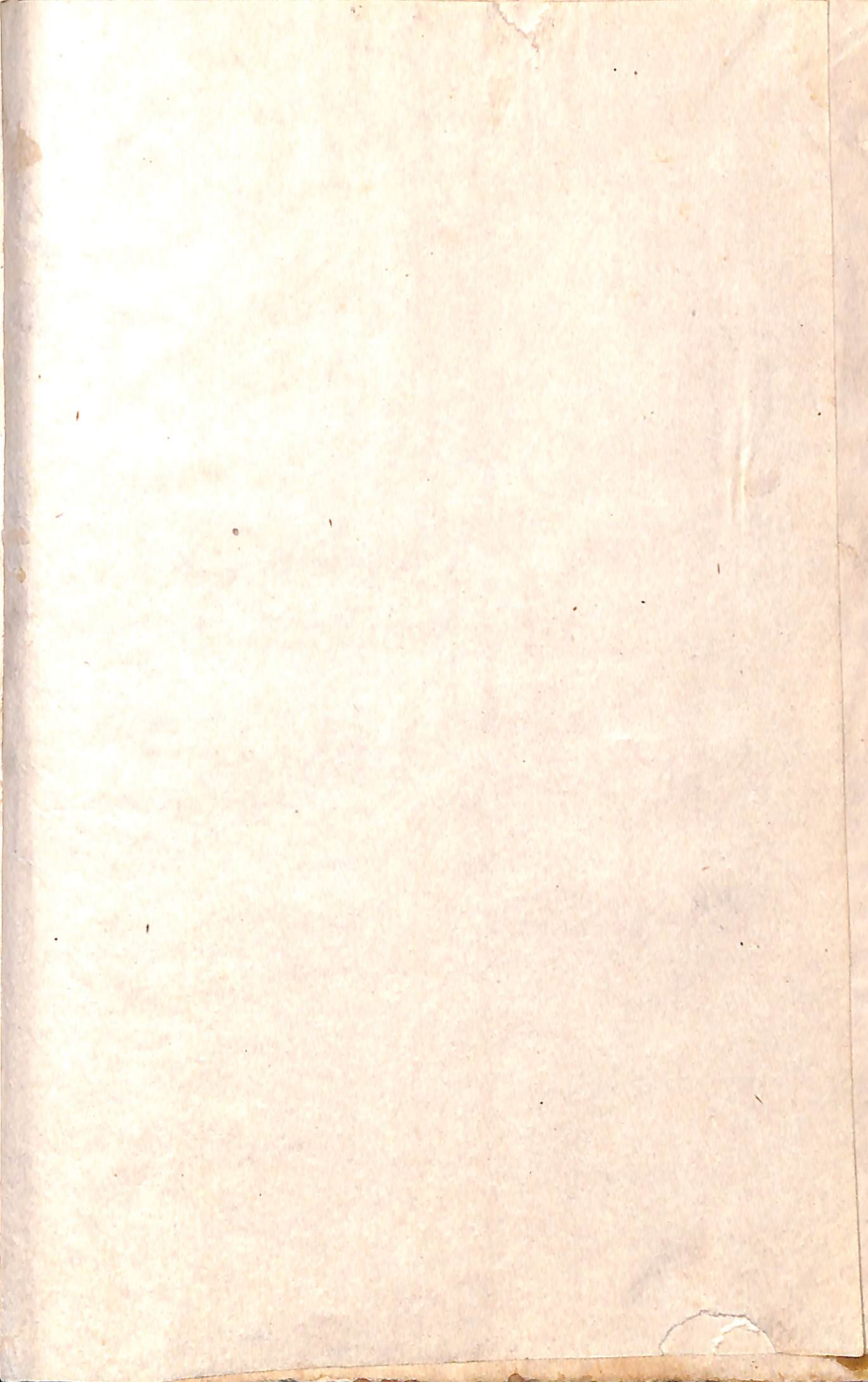
سعادت حسن منٹو

ساقی بک ڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی

قیمت ——— دس روپے
پرنٹرز ——— خواجہ پریس دہلی
کاتب ——— تصدق حسین
ناشر ——— ساقی بک ڈپو۔ اردو بازار
دہلی ۱۱۰۰۰۶
1981

اُس چُغد کے نام جو اپنے چُغد ہونے کا

بیچ کھیت اقرار کرے

فہرست
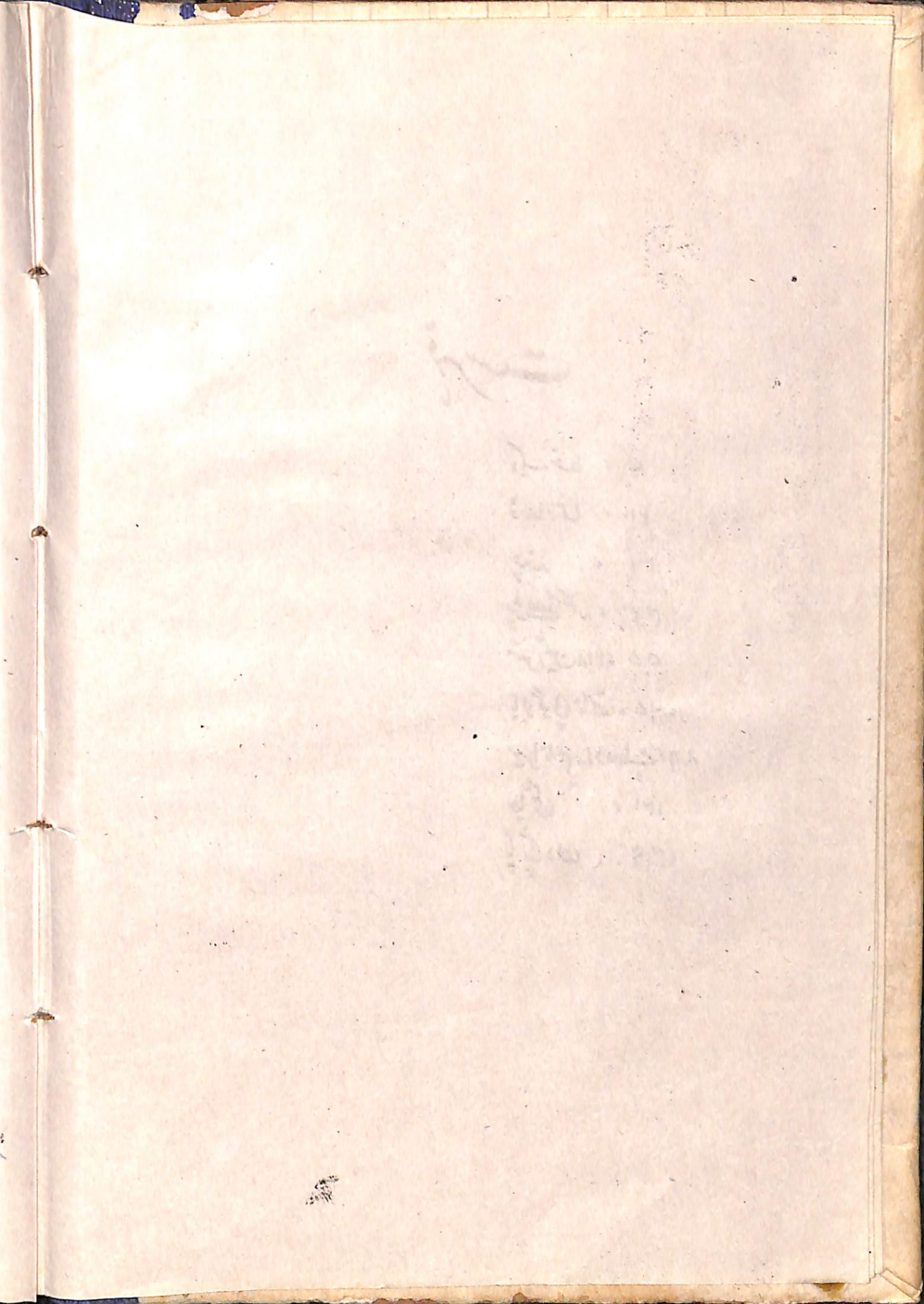
ایک خط

تمہارا طویل خط ملا جسے میں نے دو مرتبہ پڑھا۔ دفتر میں اس کے ایک ایک لفظ پر میں نے غور کیا اور غالباً اسی وجہ سے اس روز مجھے رات کے دس بجے تک کام کرنا پڑا، اس لئے کہ میں نے بہت سا وقت اس غور و فکر میں ضائع کر دیا تھا۔ تم جانتے ہو اس سرمایہ پرست دنیا میں اگر مزدور مقررہ وقت کے ایک ایک لمحے کے عوض اپنی جان کے ٹکڑے تول کر نہ دے تو اسے اپنے کام کی اُجرت نہیں مل سکتی۔ لیکن یہ رونا رونے سے کیا فائدہ؟

شام کو عزیز صاحب (جن کے یہاں میں آج کل ٹھہرا ہوا ہوں) دفتر میں تشریف لائے اور کمرے کی چابیاں دیکر کہنے لگے "میں ذرا کام سے کہیں جا رہا ہوں، شاید دیر میں آنا ہو۔ اس لئے تم میرا انتظار کئے بغیر چلے جانا۔

لیکن پھر فوراً ہی چابیاں جیب میں ڈالیں اور فرمانے لگے " نہیں تم میرا انتظار کرنا، میں دس بجے تک واپس آجاؤں گا۔"

دفتری کام سے فارغ ہوا تو دس بج چکے تھے۔ سخت نیند آ رہی تھی آنکھوں میں بڑی بھاری گدگدی ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کرسی ہی پر سو جاؤں۔

نیند کے اسی غلبے کے زیر اثر میں نے گیارہ بجے تک عزیز صاحب کا انتظار کیا۔ مگر وہ نہ آئے۔ آخر کار تھک کر میں نے گھر کی راہ لی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اُدھر ہی اُدھر گھر چلے گئے ہوں گے اور آرام سے سو رہے ہوں گے۔ آہستہ آہستہ نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں تیسری منزل پر چڑھا اور جب اندھیرے میں دروازے کی کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آہنی تالے کی ٹھنڈک نے مجھے بتایا کہ عزیز صاحب ابھی تشریف نہیں لائے۔

سیڑھیاں چڑھتے وقت میرے تھکے ہوئے اعضاء سکون بخش نیند کی قربت محسوس کر کے اور بھی ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اور جب مجھے نا امیدی کا سامنا کرنا پڑا۔ تو اور مضمحل ہو گئے۔ دیر تک چوبی سیڑھی کے ایک زینے پر سر زانوؤں میں دبائے عزیز صاحب کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئے۔ آخر کار تھک ہار کر میں اُٹھا اور تین منزلیں اتر کر نیچے بازار میں آیا اور ایسے ہی ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے پل پر جا نکلا جس کے نیچے سے ریل گاڑیاں گذرتی ہیں۔ اس پل کے پاس ہی ایک بڑا چوک ہے۔ یہاں تقریباً آدھے گھنٹے تک میں بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ اور اپنے سامنے نیم روشن بازار کو اس امید پر دیکھتا رہا کہ عزیز صاحب گھر کی جانب لوٹتے نظر آجائیں گے۔ آدھے گھنٹے کے اس انتظار کے بعد میں نے دفعتاً سر اٹھا کر کھمبے کے اوپر دیکھا بجلی کا قمقمہ میری ہنسی اڑا رہا تھا۔ جانے کیوں ؟

تھکاوٹ اور نیند کے شدید غلبے کے باعث میری کمر ٹوٹ رہی تھی، اور میں چاہتا تھا تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاؤں، بند دوکانوں کے تختے مجھے نشست پیش کر رہے تھے، مگر میں نے ان کی دعوت قبول نہ کی اور چلتا چلتا پل کی سنگین منڈیر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ کشادہ بازار بالکل خاموش تھا، آمدورفت قریب قریب بند تھی۔ البتہ کبھی کبھی دور سے موٹر کے ہارن کی رونی آواز خاموش فضا میں لرزش پیدا کرتی ہوئی اوپر کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ میرے سامنے سڑک کے دورویہ بجلی کے بلند کھمبے دور تک پھیلے چلے گئے تھے۔ جو نیند اور اس کے احساس سے عاری معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے روس کے مشہور شاعر میاتلف کی نظم کے چند اشعار یاد آ گئے یہ نظم چراغ ہائے سر راہ سے معنون کی گئی ہے۔

میاتلف، سڑک کے کنارے جھلملاتی روشنیوں کو دیکھ کر کہتا ہے ؎

یہ ننھے چراغ، یہ ننھے سردار
صرف اپنے لئے چمکتے ہیں
جو کچھ یہ دیکھتے ہیں، جو کچھ یہ سنتے
ہیں کسی کو نہیں بتاتے۔

روسی شاعر نے کچھ درست ہی کہا ہے .... میرے پاس ہی ایک گز کے فاصلے پر بجلی کا کھمبا گڑا تھا اور اس کے اوپر بجلی کا ایک شوخ چشم قمقمہ نیچے جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں مگر وہ میرے سینے کے تلاطم سے بے خبر تھا۔ اُسے کیا معلوم مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔

سگرٹ سلگانے کے لئے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو تمہارے وزنی لفافے پر پڑا۔ ذہن میں تمہارا خط پہلے ہی سے موجود تھا۔ چنانچہ میں نے

لفافہ کھول کر بسنتی رنگ کے کاغذ نکال کر انہیں پڑھنا شروع کیا۔ تم لکھتے ہو۔ "کبھی تم شیطان بن جاتے ہو۔ اور کبھی فرشتہ نظر آنے لگتے ہو۔" یہاں بھی دو تین حضرات نے میرے متعلق یہی رائے قائم کی ہے اور مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ میں واقعی دو سیرتوں کا مالک ہوں۔ اس پر میں نے اچھی طرح غور کیا ہے اور جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ کچھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

بچپن اور لڑکپن میں، میں نے جو کچھ چاہا وہ پورا نہ ہونے دیا گیا یوں کہو کہ میری خواہشات کچھ اس طرح پوری کی گئیں کہ ان کی تکمیل میرے آنسوؤں اور میری ہچکیوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں شروع ہی سے جلد باز اور زود رنج رہا ہوں۔ اگر میرا جی کسی مٹھائی کھانے کو چاہا ہے اور یہ چاہ عین وقت پر پوری نہیں ہوئی تو بعد میں میرے لئے اس خاص مٹھائی میں کوئی لذت نہیں رہی ان امور کی وجہ سے میں نے ہمیشہ اپنے حلق میں ایک تلخی سی محسوس کی ہے اور اس تلخی کی شدت بڑھانے میں اس افسوسناک حقیقت کا ہاتھ ہے۔ کہ میں نے جس سے محبت کی، جس کو اپنے دل میں جگہ دی۔ اس نے نہ صرف میرے جذبات کو مجروح کیا بلکہ میری اس کمزوری (محبت) سے زبردستی ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ وہ مجھ سے دغا فریب کرتے رہے اور لطف یہ ہے کہ میں ان تمام دغابازیوں کے احساس کے باوجود ان سے محبت کرتا رہا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے، وہ اپنی ہر نئی چال کی کامیابی پر بہت مسرور ہوتے تھے کہ انھوں نے مجھے بے وقوف بنا لیا اور میری بے وقوفی دیکھو کہ سب کچھ جانتے ہوئے بے وقوف بن جاتا تھا۔

جب اس ضمن میں مجھے ہر طرف سے ناامیدی ہوئی۔ یعنی جس کسی کو میں نے دل سے چاہا۔ اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا تو میری طبیعت بجھ گئی

اور میں نے محسوس کیا کہ ریگستان میں ایک بھونرے کے مانند ہوں جسے رس چوسنے کے لئے حدِ نظر تک کوئی پھول نظر نہیں آسکتا۔ لیکن اس کے باوجود محبت کرنے سے باز نہ رہا اور حسبِ معمول کسی نے بھی میرے اس جذبے کی قدر نہ کی جب پانی سر سے گذر گیا اور مجھے اپنے نام نہاد دوستوں کی بے وفائیاں اور سرد مہریاں یاد آنے لگیں تو میرے سینے کے اندر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ میرے جذباتی، سرمدی اور ناطق وجود میں ایک جنگ سی چھڑ گئی۔

ناطق وجود ان لوگوں کو ملعون و مطعون گردانتے ہوئے اور گذشتہ واقعات کی افسوسناک تصویر دکھاتے ہوئے اس بات کا طالب تھا کہ میں آئندہ سے اپنا دل پتھر کا بنا لوں اور محبت کو ہمیشہ کے لئے باہر نکال پھینکوں، لیکن جذباتی وجود ان افسوسناک واقعات کو دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہوئے مجھے فخر کرنے پر مجبور کرتا تھا کہ میں نے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کی نظر میں ناکامیاں ہی کامیابیاں تھیں وہ چاہتا تھا کہ محبت کئے جاؤں کہ یہی کائنات کی روحِ رواں ہے۔ تحت الشعور وجود اس جھگڑے میں بالکل الگ تھلگ رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک نہایت ہی عجیب و غریب نیند کا غلبہ طاری ہے۔

یہ جنگ خدا جانے کس نامبارک روز شروع ہوئی کہ اب میری زندگی کا ایک جزوین کے رہ گئی ہے۔ دن ہو یا رات جب کبھی مجھے فرصت کے چند لمحات میسّر آتے ہیں، تو میرے سینے کے چٹیل میدان پر میرا ناطق وجود اور جذباتی وجود ہتھیار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان لمحات میں جب ان دونوں کے درمیان لڑائی زوروں پر ہو، اگر میرے ساتھ کوئی ہم کلام ہو تو میرا لہجہ یقیناً کچھ اور قسم کا

ہوتا ہے - میرے حلق میں ایک ناقابل بیان تلخی گھل رہی ہوتی ہے آنکھیں گرم ہوتی ہیں اور جسم کا ایک ایک عضو بےکل ہوتا ہے - میں بہت کوشش کیا کرتا ہوں کہ اپنے لہجے کو درشت نہ ہونے دوں اور بعض اوقات میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں، لیکن اگر میرے کانوں کو کوئی ناگوار چیز سنائی دے یا میں کوئی ایسی چیز محسوس کروں جو میری طبیعت کے یکسر خلاف ہے تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتا - میرے سینے کی گہرائیوں سے جو کچھ بھی اٹھے زبان کے راستے باہر نکل جاتا ہے اور اکثر اوقات جو الفاظ بھی ایسے مواقع پر میری زبان پر آتے ہیں بے حد تلخ ہوتے ہیں - ان کی تلخی اور درشتی کا احساس مجھے اس وقت کبھی نہیں ہوا - اس لئے کہ میں اپنے اخلاص سے ہمیشہ اور ہر وقت باخبر رہتا ہوں اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا - اگر میں نے اپنے ملنے والوں میں سے یا کسی دوست کو ناخوش کیا ہے تو اس کا باعث میں نہیں ہوں بلکہ یہ خاص لمحات ہیں جب میں دیوانے سے کم نہیں ہوتا - یا تمہارے الفاظ میں "شیطان" ہوتا ہوں گو یہ لفظ بہت سخت ہے اور اس کا اطلاق میری دیوانگی پر نہیں ہو سکتا -

جب تمہارا پچھلے سے پچھلا خط موصول ہوا تھا - اس وقت میرا ناطق وجود جذباتی وجود پر غالب تھا اور میں اپنے دل کے نرم و نازک گوشت کو پتھر میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا - میں پہلے ہی سے اپنے سینے کی آگ میں پھنکا جا رہا تھا کہ اوپر سے تمہارے خط نے تیل ڈال دیا -

تم نے بالکل درست کہا ہے "تم درد مند دل رکھتے ہو، گو اس کو اچھا نہیں سمجھتے" میں اس کو اچھا کیوں نہیں سمجھتا - ؟ اس سوال کا جواب ہندستان

کا موجودہ انسانیت کش نظام ہے جس میں لوگوں کی جوانی پر بڑھاپے کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔

میرا دل درد سے بھرا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں علیل ہوں اور علیل رہتا ہوں۔ جب تک درد مندی میرے سینے میں موجود ہے میں ہمیشہ بے چین رہوں گا۔ تم شاید اسے مبالغہ یقین کرو مگر یہ واقعہ ہے کہ "دردمندی" میرے لہو کی بوندوں سے اپنی خوراک حاصل کر رہی ہے۔ اور ایک دن ایسا آئے گا۔ جب صرف درد ہی درد رہ جائے گا اور تمہارا دوست دنیا کی نظروں سے غائب ہو جائے گا۔ میں اکثر سوچتا ہوں دردمندی کے اس جذبے نے مجھے کیسے کیسے بھیانک دکھ پہنچائے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ میری جوانی کے دن بڑھاپے کی راتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور جب یہ سوچتا ہوں تو اس بات کا تہیہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ مجھے اپنا دل پتھر بنا لینا چاہیئے۔ لیکن افسوس ہے اس دردمندی نے مجھے اتنا کمزور بنا دیا ہے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا اور چونکہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میری طبیعت میں عجیب و غریب کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔

شعر میں اب بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا، اس لئے کہ شاعری سے مجھے بہت کم دلچسپی رہی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا کامل طور پر احساس ہے کہ میری طبیعت شاعری کی طرف مائل ہے۔ شہر میں بسنے والے لوگوں کی "وزنی شاعری" مجھے پسند نہیں۔ دیہات کے ہلکے پھلکے نغمے مجھے بے حد بھاتے ہیں یہ اس قدر شفاف ہوتے ہیں کہ اُن کے پیچھے دل دھڑکتے ہوئے نظر آ سکتے ہیں۔ تمہیں حیرت ہے کہ میں "رومانی حزینہ" کیوں کر لکھنے لگا اور میں اس بات پر خود حیران ہوں۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے محسوسات کو دوسروں کی زبان میں بیان کر کے اپنا سینہ خالی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ "ذہنی مفلس" ہیں اور مجھے ان پر ترس آتا ہے۔ یہ ذہنی افلاس مالی افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں مالی مفلس ہوں مگر خدا کا شکر ہے ذہنی مفلس نہیں ہوں ورنہ میری مصیبتوں کی کوئی حد نہ ہوتی۔ مجھے کتنا بڑا اطمینان ہے کہ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں وہی اپنی زبان میں بیان کر لیتا ہوں۔

میں نے اپنے افسانوں کے متعلق کبھی غور نہیں کیا۔ اگر ان میں کوئی چیز بقول تمہارے "جلوہ گر" ہے تو میرا "بے کل باطن" ہے۔ میرا ایمان نہ تشدد پر ہے اور نہ عدم تشدد پر۔ دونوں پر ہے اور دونوں پر نہیں۔ موجودہ تغیر پسند ماحول میں رہتے ہوئے میرے ایمان میں استقلال نہیں رہا۔ آج میں ایک چیز کو اچھا سمجھتا ہوں لیکن دوسرے روز سورج کی روشنی کے ساتھ ہی اس چیز کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ اس کی تمام اچھائیاں برائیاں بن جاتی ہیں۔ انسان کا علم بہت محدود ہے اور میرا علم محدود ہونے کے علاوہ منتشر بھی ہے۔ ایسی صورت میں تمہارے اس سوال کا میں کیونکر دے سکتا ہوں؟

"مجھ" پر مضمون لکھ کر کیا کرو گے پیارے! میں اپنے قلم کی مقراض سے اپنا لباس پہلے ہی تار تار کر چکا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اور ننگا کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میرے چہرے سے اگر تم نے نقاب اٹھا دی تو تم دنیا کو ایک بہت ہی بھیانک شکل دکھاؤ گے۔ میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہوں۔ جس پر میرا قلم کبھی کبھی پتلی جھلی منڈھتا رہتا ہے۔ اگر تم نے جھلیوں کی یہ تہہ ادھیڑ ڈالی تو میرا خیال ہے جو ہیئت تمہیں منہ کھولے نظر آئے گی

اسے دیکھنے کی تاب تم خود میں نہ پاؤ گے۔

میری کشمیر کی زندگی! ہائے میری کشمیر کی زندگی!! مجھے معلوم ہے، تمہیں میری زندگی کے اس خوشگوار ٹکڑے کے متعلق مختلف قسم کی باتیں معلوم ہوتی رہی ہیں۔ یہ باتیں جن لوگوں کے ذریعہ سے تم تک پہنچی ہیں۔ انکو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لئے تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ تم ان کو سن کر ابھی تک کوئی صحیح رائے مرتب نہیں کر سکے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ کہنے کے باوجود تم نے ایک رائے مرتب کی ہے اور ایسا کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔ اگر تم میری تمام تحریروں کو پیش نظر رکھ لیتے تو تمہیں یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہوتی کہ میں کشمیر میں ایک سادہ لوح لڑکی سے کھیلتا رہا ہوں۔ میرے دوست تم نے مجھے صدمہ پہنچایا ہے۔

وزیرہ کون تھی؟ ــــــــ اس کا جواب مختصر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دیہاتی لڑکی تھی۔ جوان اور پوری جوان! اس پہاڑی لڑکی کے متعلق جس نے میری کتاب زندگی کے کچھ اوراق پر چند حسین نقوش بنائے ہیں میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔

میں نے وزیرہ کو تباہ نہیں کیا اگر تباہی سے تمہاری مراد "جسمانی تباہی" ہے تو پہلے ہی سے تباہ شدہ تھی اور وہ اسی تباہی میں اپنی مسرت کی جستجو کرتی۔ جوانی کے نشے میں مخمور اس نے اس غلط خیال کو اپنے دماغ میں جگہ دے رکھی تھی کہ زندگی کا اصلی حظ اور لطف اپنا خون کھولانے میں ہے اور وہ اس غرض کے لئے ہر وقت ایندھن چنتی رہتی تھی۔ یہ تباہ کن خیال اسکے دماغ میں کیسے پیدا ہوا، اس کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ہماری صنف میں ایسے افراد کی کمی نہیں جن کا کام صرف بھولی بھالی لڑکیوں سے کھیلنا ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا اپنا خیال ہے وزیرہ اس چیز کا شکار تھی جسے تہذیب و تمدن کا نام دیا جاتا ہے ــــــــ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے جو شہروں

کے شور و شر سے بہت دور ہمالہ کی گود میں آباد ہے اور اب تہذیب و تمدن کی بدولت شہروں سے اس کا تعارف کرا دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں شہروں کی گندگی اس جگہ منتقل ہونا شروع ہو گئی ہے۔

خالی سلیٹ پر تم جو کچھ بھی لکھو گے نمایاں طور پر نظر آئے گا اور صاف پڑھا جائے گا۔ وزیر کا سینہ بالکل خالی تھا۔ دنیوی خیالات سے پاک اور صاف لیکن تہذیب کے کھردرے ہاتھوں نے اس پر نہایت بھدے نقش بنا دیئے تھے۔ جو مجھے اس کی غلط روش کا باعث نظر آتے ہیں۔

وزیر کا مکان یا جھونپڑا سڑک کے اوپر پہاڑ کی ڈھلوان میں واقع تھا اور میں اس کی ماں کے کہنے پر ہر روز اس سے ذرا اوپر چیڑ کے درختوں کی چھاؤں میں زمین پر دری بچھا کر کچھ لکھا پڑھا کرتا تھا اور عام طور پر وزیر میرے پاس ہی اپنی بھینس چرایا کرتی تھی۔ چونکہ ہوٹل سے ہر روز دری اٹھا کر یہاں لانا اور اسے واپس لے جانا میرے جیسے آدمی کے لئے ایک عذاب تھا۔ اس لئے میں اسے ان کے مکان ہی میں چھوڑ جاتا تھا ایک روز کا واقعہ ہے۔ مجھے غسل کرنے میں دیر ہو گئی۔ اور میں ٹہلتا ٹہلتا پہاڑی کے دشوار گزار راستوں کو طے کر کے جب ان کے گھر پہنچا اور دری طلب کی تو اس کی بڑی بہن کی زبانی معلوم ہوا کہ وزیر دری لے کر اوپر چلی گئی ہے۔ یہ سن کر میں اور اوپر چڑھا اور جب اس بڑے پتھر کے قریب آیا جسے میں میز کے طور پر استعمال کرتا تھا تو میری نگاہیں وزیر پر پڑیں۔ دری اپنی جگہ پر بچھی ہوئی تھی اور وہ اپنا سبز کلف لگا دوپٹہ تانے سو رہی تھی۔

میں دیر تک پتھر پر بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ سونے کا بہانہ کر کے

لیٹی ہے۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اسے جگانے کی کوشش کروں گا اور وہ گہری نیند کا بہانہ کرکے جاگنے میں دیر کرے گی۔ لیکن میں خاموش بیٹھا رہا بلکہ اپنے چرمی تھیلے سے ایک کتاب نکال کر اس کی طرف پیٹھ کرکے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ جب نصف گھنٹہ اسی طرح گزر گیا تو وہ مجبور ہو کر بیدار ہوئی۔ انگڑائی لے کر اس نے عجیب سی آواز منہ سے نکالی۔ میں نے کتاب بند کر دی اور مڑ کر اس سے کہا۔

"میرے آنے سے تمہاری نیند تو خراب نہیں ہوئی۔"

وزیر نے آنکھیں مل کر لہجے کو خواب آلود بناتے ہوئے کہا۔ "آپ کب آئے تھے۔؟"

"ابھی ابھی آکے بیٹھا ہوں۔ سونا ہے تو سو جاؤ۔"

"نہیں ــــــ آج نگوڑی نیند کو جانے کیا ہو گیا۔ کمر سیدھی کرنے کے لئے یہاں ذرا سی ذری لیٹی تھی کہ بس سو گئی ــــــ دو گھنٹے سے کیا کم سوئی ہوں گی۔"

اس کے گیلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے جو کچھ باہر جھانک رہا تھا۔ اس کو میرا قلم بیان کرنے سے عاجز ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت اس کے دل میں یہ احساس کروٹیں لے رہا تھا کہ اس کے سامنے ایک مرد بیٹھا ہے اور وہ عورت ہے ــــــ جوان عورت ــــــ شباب کی امنگوں کا ابلتا ہوا چشمہ!

تھوڑی دیر کے بعد وہ غیر معمولی باتونی بن گئی اور بہک سی گئی مگر میں نے اس کی بھینس اور بچھڑے کا ذکر چھیڑنے کے بعد ایک دلچسپ کہانی سنائی جس میں ایک بچھڑے سے اس کی ماں کی الفت کا ذکر تھا۔ اس سے

اس کی آنکھوں میں وہ شرارے سرد ہو گئے جو کچھ عرصہ پہلے لپک رہے تھے۔

میں زاہد نہیں ہوں اور نہ میں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا ہے۔ گناہ و ثواب اور سزا و جزا کے متعلق میرے خیالات دوسروں سے جدا ہیں۔ اور یقیناً تمہارے خیالات سے بھی بہت مختلف ہیں۔ میں اس وقت ان بحثوں میں نہیں پڑنا چاہتا اس لئے کہ اس کے لئے سکونِ قلب اور وقت درکار ہے۔ برسبیلِ تذکرہ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے تم میرے خیالات کے متعلق کچھ اندازہ لگا سکو گے۔

باتوں باتوں میں ایک مرتبہ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ حُسن اگر پورے شباب اور جوبن پر ہو تو وہ دلکشی کھو دیتا ہے۔ مجھے اب بھی اس خیال پر ایمان ہے۔ مگر میرے دوست نے اسے مہمل منطق قرار دیا۔ ممکن ہے تمہاری نگاہ میں بھی یہ مہمل ہو۔ مگر میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں اس حسن نے میرے دل کو اپنی طرف کبھی راغب نہیں کیا جو پورے شباب پر ہو۔ اس کو دیکھ کر میری آنکھیں ضرور چندھیا جائیں گی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس حسن نے اپنی تمام کیفیتیں میرے دل و دماغ پر طاری کر دی ہیں۔ شوخ اور بھڑکیلے رنگ اس بلندی تک کبھی نہیں پہنچ سکتے جو نرم و نازک الوان و خطوط کو حاصل ہے۔ وہ حسن یقیناً قابلِ احترام ہے جو آہستہ آہستہ نگاہوں میں جذب ہو کر دل میں اُتر جائے۔ روشنی کا خیرہ کن شعلہ دل کے بجائے اعصاب پر اثر انداز ہوتا ہے ــــ لیکن اس فضول بحث میں پڑنے سے کیا فائدہ؟

میں کہہ رہا تھا کہ میں زاہد نہیں ہوں اور کہتے وقت میں دبی زبان سے بہت سی چیزوں کا اعتراف بھی کر رہا ہوں۔ لیکن اس پہاڑی لڑکی سے

جو جسمانی لذتوں کی دلدادہ تھی میرے تعلقات صرف ذہنی اور روحانی تھے میں نے شاید تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر عورت سے دوستی کی جائے تو اس کے اندر ندرت ہونی چاہیئے۔ اس سے اس طرح ملنا چاہیئے کہ وہ تمہیں دوسروں سے بالکل علیحدہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے اسے تمہارے دل کی ہر دھڑکن میں ایسی صدا سنائی دے جو اس کے کانوں کے لئے نئی ہو۔

عورت اور مرد ــــــ اور ان کا باہمی رشتہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے۔ لیکن معاف کرنا یہ رشتہ میری نظروں میں فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس میں یکسر حیوانیت ہے: میں پوچھتا ہوں اگر مرد کو اپنی محبت کا مرکز کسی عورت ہی کو بنانا ہے تو وہ انسانیت کے اس مقدس جذبے میں حیوانیت کو کیوں داخل کرے؟ ــــ کیا اس کے بغیر محبت کی تکمیل نہیں ہو سکتی؟ ــ کیا جسم کی مشقت کا نام محبت ہے۔؟

وزیر اس غلط فہمی میں مبتلا تھی۔ کہ جسمانی لذتوں کا نام محبت ہے۔ اور میرا خیال ہے جس مرد سے بھی وہ ملتی تھی وہ محبت کی تعریف انہی الفاظ میں بیان کرتا تھا۔ میں اس سے ملا اور اس کے تمام خیالات کی ضد بن کر میں نے اس سے دوستی پیدا کی۔ اس نے اپنے شوخ رنگ خوابوں کی تعبیر میرے وجود میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر اسے مایوسی ہوئی۔ لیکن چونکہ وہ غلط کار ہونے کے ساتھ ساتھ معصوم تھی۔ میری سیدھی سادی باتوں نے اس کی مایوسی کو حیرت میں تبدیل کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کی یہ حیرت اس [illegible] کی شکل اختیار کر گئی کہ وہ اس نئی رسم و راہ کی گہرائیوں سے واقفیت حاصل کرے۔ یقیناً ایک مقدس معصومیت میں تبدیل ہو [illegible] اپنی [illegible]

پھر سے حاصل کر لیتی جسے وہ غلط راستے پر چل کر کھو بیٹھی تھی۔ لیکن افسوس ہے مجھے اس پہاڑی گاؤں سے دفعتہً پُرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے شہر واپس آنا پڑا۔

مجھے وہ اکثر یاد آتی ہے ـــــ کیوں؟ ـــــ اس لئے کہ رخصت ہوتے وقت اس کی سدا متبسم آنکھوں میں دو چھلکتے آنسو بتا رہے تھے کہ وہ میرے جذبے سے کافی متاثر ہو چکی ہے اور حقیقی محبت کی ایک ننھی سی شعاع اس کے سینے کی تاریکی میں داخل ہو چکی ہے ـــــ کاش میں وزیر کو محبت کی تمام عظمتوں سے روشناس کرا سکتا اور کیا پتہ ہے کہ وہ پہاڑی لڑکی مجھے وہ چیز عطا کر دیتی جس کی تلاش میں میری جوانی بڑھاپے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

یہ ہے میری داستان جس میں بقول تمہارے لوگ اپنی دلچسپی کا سامان تلاش کرتے ہیں ـــــ تم نہیں سمجھتے اور نہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں یہ داستانیں کیوں لکھتا ہوں ـــــ پھر کبھی سمجھاؤں گا۔

~ ❖ ~

ڈھارس

آج سے ٹھیک آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔

ہندو سبھا کالج کے سامنے جو خوب صورت شادی گھر ہے۔ اس میں ہمارے دوست بشیشر ناتھ کی برات ٹھہری ہوئی تھی۔ تقریباً تین ساڑھے تین سو کے قریب مہمان تھے جو امرتسر اور لاہور کی نامور طوائفوں کا مجرا سننے کے بعد اس وسیع عمارت کے مختلف کمروں میں فرش پر یا چارپائیوں پر گہری نیند سو رہے تھے۔

چار بج چکے تھے۔ میری آنکھوں میں بشیشر ناتھ کے ساتھ ایک علیحدہ کمرے میں خاص خاص دوستوں کی موجودگی میں پی ہوئی وسکی کا خمار ابھی تک باقی تھا۔ جب ہال کے گول کلاک نے چار بجائے تو میری آنکھ کھلی شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ پلکوں میں کچھ چیز پھنسی پھنسی معلوم

ہوتی تھی۔

ایک آنکھ بند کرکے شاید اس خیال سے کہ دوسری آنکھ ابھی کچھ دیر سوتی رہے۔ میں نے ہال کے فرش پر نظر دوڑائی —— سب سو رہے تھے۔ کچھ اوندھے، کچھ سیدھے اور کچھ چاقو سے بنے ہوئے۔ میں نے اب دوسری آنکھ کھولی اور دیکھا۔ رات کو پینے کے بعد جب ہم ہال میں آکر لیٹے تھے تو اصغر علی نے ضد کی تھی کہ وہ گاؤ تکیہ لے کر سوئے گا۔ گاؤ تکیہ میرے سر سے کچھ فاصلے پر پڑا تھا مگر اصغر موجود نہیں تھا۔

میں نے سوچا۔ حسب معمول رات بھر جاگتا رہا ہے اور اس وقت یہاں سے بہت دور رام باغ میں کسی معمولی ٹکھیائی کے میلے بستر پر سو رہا ہے۔

اصغر علی کے لئے شراب دیسی ہو یا انگریزی ایک تیز گاڑی تھی جو اسے فوراً عورت کی طرف کھینچ کرلے جاتی تھی۔ شراب پینے کے بعد یوں تو ننانوے فیصدی مردوں کو خوبصورت چیزیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ لیکن اصغر جو نہایت اچھا فوٹوگرافر اور پینٹر تھا —— جو رنگوں اور لکیروں کا صحیح امتزاج جانتا تھا، شراب پینے کے بعد ہمیشہ نہایت ہی بھونڈی تصویر پیش کیا کرتا تھا۔

میری پلکوں میں پھنسے ہوئے خواب کے ٹکڑے نکل گئے اور میں نے اصغر علی کے متعلق سوچنا شروع کیا جو خواب نہیں تھا۔ اس کے لمبے بالوں والے وزنی سر کا دباؤ گاؤ تکیے پر مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔

کئی بار غور کرنے کے باوجود میں سمجھ نہ سکا تھا کہ شراب پی کر اصغر کا دل و دماغ شل کیوں ہو جاتا ہے۔ شل تو نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ وہ خوفناک

طور پر بیدار ہو جاتا تھا اور اندھیری سے اندھیری گلیوں میں ٹھیلا راستہ تلاش کرتا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کسی نہ کسی جسم بیچنے والی عورت کے پاس پہنچ ہی جاتا۔ اس کے غلیظ بستر سے اٹھ کر جب وہ صبح نہا دھو کر اپنے اسٹوڈیو پہنچتا اور صاف ستھری تندرست جوان اور خوبصورت لڑکیوں اور عورتوں کی تصویریں اتارتا تو اس کی آنکھوں میں حیوانیت کی ہلکی سی جھلک بھی نہ ہوتی جو شرابی حالت میں ہر دیکھنے والے کو نظر آسکتی تھی۔

یقیناً اپنے شراب پی کر وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ اس کے دماغ سے خود احتسابی کچھ عرصے کے لئے بالکل مفقود ہو جاتی تھی۔ آدمی کتنی پی سکتا ہے؟ چھ، سات، آٹھ پیگ ـــــ مگر اس لیطاہر بے ضرر سیال مادے کے چھ یا سات گھونٹ اسے شہوت کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیتے تھے۔

آپ وسکی میں سوڈا یا پانی ملا سکتے ہیں۔ لیکن عورت کو اس میں حل کرنا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شراب پی جاتی ہے غم غلط کرنے کیلئے ـــــ عورت کوئی غم تو نہیں۔ شراب پی جاتی ہے شور مچانے کے لئے ـــــ عورت کوئی شور تو نہیں۔

رات اصغر نے شراب پی کر بہت شور مچایا۔ شادی بیاہ پر چونکہ ویسے ہی کافی ہنگامہ ہوتا ہے، اس لئے یہ شور دب گیا ورنہ مصیبت برپا ہو جاتی ـــــ ایک دفعہ وسکی سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا "میں بہت اونچا آدمی ہوں ـــــ اونچی جگہ بیٹھ کر پیوں گا"

میرا خیال تھا۔ رام باغ میں کسی اونچے کوٹھے کی تلاش میں چلا گیا ہے، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب دروازہ کھلا تو وہ ایک لکڑی کی سیڑھی لئے اندر داخل ہوا اور اسے دیوار کے ساتھ لگا کر سب سے اوپر والے ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور چھت کے ساتھ سر لگا کر پینے لگا۔

بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اور بشیشر نے اسے نیچے اتارا اور سمجھایا کہ ایسی حرکتیں صرف اسی وقت اچھی لگتی ہیں۔ جب کوئی اور موجود نہ ہو، شادی گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہے۔ اسے خاموش رہنا چاہیئے۔ معلوم نہیں کیسے یہ بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی، کیونکہ جب تک پارٹی جاری رہی۔ وہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا اپنے حقے کی وسکی پیتا رہا۔

یہ سوچتے سوچتے میں اٹھا اور باہر بالکنی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہندو سبھا کالج کی لال لال اینٹوں والی عمارت صبح کے خاموش اندھیارے میں لپٹی ہوئی تھی۔ آسمان کی طرف دیکھا تو کئی تارے مٹیالے آسمان پر کانپتے ہوئے نظر آئے۔

مارچ کے آخری دنوں کی خنک ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ میں نے سوچا چلو اوپر چلیں۔ کھلی جگہ سے کچھ دیر گھر کے بنے ہوئے شہ نشین پر لیٹیں گے۔ سردی محسوس ہونے پر بدن میں جو تیز تیز جھرجھریاں پیدا ہوں گی۔ ان کا مزا آئے گا۔

لمبا برآمدہ طے کر کے جب میں سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اوپر سے کسی کے اترنے کی آواز آئی۔ چند لمحات کے بعد اصغر نمودار ہوا اور مجھ سے کلام کئے بغیر پاس سے گذر گیا۔ اندھیرا تھا میں نے سوچا شاید اس نے مجھے دیکھا نہیں چنانچہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر میں نے چڑھنا شروع کیا۔

میری عادت ہے، جب کبھی میں سیڑھیاں چڑھتا ہوں تو اس کے زینے ضرور گنتا ہوں۔ میں نے دل میں چودہ ہیں کہا اور دفعتاً مجھے آخری زینے پر ـــــ ایک عورت کھڑی نظر آئی میں بوکھلا گیا کیونکہ قریب قریب ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔

"معاف کر دیجئے گا .... اوہ آپ؟"

عورت شاردا تھی۔ ہماری ہمسائی ہرنام کور کی بڑی لڑکی جو شادی کے ایک برس بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ پیشتر اس کے میں اس سے کچھ اور کہوں اس نے مجھ سے بڑی تیزی سے پوچھا "یہ کون تھا جو ابھی نیچے گیا ہے؟"

"کون؟"

"وہی آدمی جو ابھی نیچے اتر کے گیا ہے ـــــ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"جانتا ہوں۔"

"کون ہے؟"

"اصغر۔"

"اصغر!" اس نے یہ نام اپنے دانتوں کے اندر جیسے کاٹ دیا۔ اور مجھے جو کچھ بھی ہوا تھا اس کا علم ہو گیا ـــ

"کیا اس نے کوئی بدتمیزی کی ہے؟"

"بدتمیزی!" شاردا کا دوہرا جسم غصے سے کانپ اٹھا۔ "لیکن لیکن میں کہتی ہوں، اس نے مجھے سمجھا کیا ...." یہ کہتے ہوئے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اس نے ..... اس نے ...." اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

میں عجیب الجھن میں پھنس گیا۔ سوچنے لگا اگر رونے کی آواز سنکر کوئی اوپر آگیا تو ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ شاردا کے چار بھائی ہیں اور چاروں کے چاروں شادی گھر میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو تو ہر وقت دوسروں سے لڑائی کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اصغر علی کی اب خیر نہیں۔

میں نے اس کو سمجھانا شروع کیا " دیکھئے، آپ روئیے نہیں... کوئی سن لے گا "

ایک دم دونوں ہاتھ اپنے منہ سے ہٹا کر اس نے تیز آواز میں کہا۔ " سن لے...... میں سنانا ہی تو چاہتی ہوں...... مجھے آخر اس نے سمجھا کیا تھا...... بازاری عورت ؟.... میں.... میں... "

آواز پھر اس کے حلق میں اٹک گئی۔

" میرا خیال ہے اس معاملہ کو تمہیں دبا دینا چاہیئے "۔

" کیوں ؟

" بدنامی ہوگی "

" کس کی ؟ ——— میری یا اس کی ؟ "

" بدنامی تو اس کی ہوگی لیکن کیچڑ میں ہاتھ ڈالنے کا فائدہ ہی کیا ہے ؟ " یہ کہہ کر میں نے اپنا رومال نکال کر اسے دیا " لیجئے آنسو پونچھ لیجئے "

رومال فرش پر پٹک کر وہ ستہ نشین پر بیٹھ گئی۔ میں نے رومال اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا " شاردا دیوی۔ اصغر میرا دوست ہے اس سے جو غلطی ہوئی میں اس کی معافی چاہتا ہوں "

آپ کیوں معافی مانگتے ہیں ؟ "

" اس لئے کہ میں یہ معاملہ رفع دفع کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے آپ کہیں تو

میں اسے یہاں لے آتا ہوں ۔ وہ آپ کے سامنے ناک سے لکیریں بھی کھینچ دے گا ۔"

نفرت سے اس نے اپنا منہ پھیر لیا ۔" نہیں —— اس کو میرے سامنے مت لائیے گا —— اس بے چارے کا گلا رندھ گیا ، اور شہ نشین کی مرمریں سل پہ کہنیوں کے بل دوہری ہو کر اس نے مجروح جذبات کے اٹھتے ہوئے فوارے کو دبانے کی ناکام کوشش کی ۔

میں بوکھلا گیا —— ایک جوان اور تندرست عورت میرے سامنے رو رہی تھی اور میں اسے چپ نہیں کرا سکتا تھا ۔ ایک دفعہ اسی اصغر کی موٹر چلاتے چلاتے میں نے ایک کتے کو بچانے کے لئے ہارن بجایا ۔ شامت اعمال ایسا ہاتھ پڑا کہ ہارن پھنس وہیں ، آواز —— ایک نہ ختم ہونے والا شور بن کے رہ گئی ہزار کوشش کر رہا ہوں کہ ہارن بند ہو جائے مگر وہ پڑا چلا رہا ہے ..... لوگ دیکھ رہے ہیں اور میں مجسم بے چارگی بنا بیٹھا ہوں ۔

خدا کا شکر ہے کوٹھے پر میرے اور شاردا کے سوا اور کوئی نہیں تھا ۔ لیکن میری بے چارگی کچھ اس ہارن والے معاملے سے سوا تھی ۔ میرے سامنے ایک عورت رو رہی تھی جس کو بہت دکھ پہنچا تھا ۔

کوئی اور عورت ہوتی تو میں تھوڑی دیر اپنا فرض ادا کرنے کے بعد چلا جاتا ۔ مگر شاردا ہمسائی کی لڑکی تھی اور میں اسے بچپن سے جانتا تھا ۔

بڑی اچھی لڑکی تھی ۔ اپنی تین چھوٹی بہنوں کے مقابلے میں کم خوبصورت لیکن بہت ذہین ۔ کروشیے اور سلائی کے کام میں چابک دست اور کم گو ۔ جب پچھلے برس شادی کے عین ساڑھے گیارہ مہینوں کے بعد اس کا خاوند ریل کے حادثے میں مر گیا تھا تو ہم سب گھر والوں کو بہت افسوس ہوا تھا ۔

خاوند کی موت کا صدمہ کچھ اور ہے، مگر یہ صدمہ جو شاردا کو میرے ایک واہیات دوست نے پہنچایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت بالکل مختلف اور بہت اذیت دہ تھی۔

میں نے اس کو چپ کرانے کی ایک بار اور کوشش کی۔ شہ نشین پر اس کے پاس بیٹھ کر میں نے اس سے کہا "شاردا یوں روئے جانا ٹھیک نہیں۔ جاؤ نیچے چلی جاؤ اور جو کچھ ہوا ہے اس کو بھول جاؤ ——— وہ کمبخت شراب پئے تھا ——— ورنہ یقین جانو اتنا بُرا آدمی نہیں۔ شراب پی کر جانے کیا ہو جاتا ہے اسے۔"

شاردا کا رونا بند نہ ہوا۔

مجھے معلوم تھا اصغر نے کیا کیا ہوگا۔ کیونکہ عام مردوں کا ایک ہی طریقہ ہوتا ہے، جسمانی، لیکن پھر بھی میں خود شاردا کے منہ سے سننا چاہتا تھا کہ اصغر نے کس طور پر یہ بے ہودگی کی، چنانچہ میں نے اسی ہمدردانہ لہجے میں اس سے کہا "معلوم نہیں اس نے تم سے کیا بدتمیزی کی ہے، لیکن کچھ نہ کچھ میں سمجھ سکتا ہوں ——— تم اوپر کیا کرنے آئی تھیں؟"

شاردا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "میں نیچے کمرے میں سو رہی تھی ان دو عورتوں نے میرے متعلق باتیں شروع کر دیں"

آواز ایک دم اس کے گلے میں رُندھ گئی۔

"میں نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی تھیں؟"

شاردا نے اپنا منہ مرمریں سل پر رکھ دیا اور بہت زور سے رونے لگی۔

میں نے اس کے چوڑے کاندھوں پر ہولے ہولے تھپکی دی۔

"چپ کر جاؤ شاردا ——— چپ کر جاؤ۔"

روتے روتے ہچکیوں کے درمیان اس نے کہا "وہ کہتی تھیں —— وہ کہتی تھیں —— اس ودھوا کو یہاں کیوں بلایا گیا ہے ؟"

ودھوا کہتے ہوئے شاردا نے اپنے آنسوؤں بھرے دوپٹے کا ایک کونہ منہ میں چبا لیا۔ "یہ سن کر میں رونے لگی اور اوپر چلی آئی ..... اور ..... اور ....؟"

یہ سن کر مجھے بھی شدید دکھ ہوا —— عورتیں کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ خاص طور پر بوڑھی۔ زخم تازہ ہوں یا پرانے کیا مزے لے لے کر کریدتی ہیں۔ میں نے شاردا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پرخلوص ہمدردی سے دبایا "ایسی باتوں کی بالکل پروا نہیں کرنی چاہیئے۔"

وہ بچے کی طرح بلکنے لگی "میں نے اوپر آکر یہی سوچا تھا اور سو گئی تھی کہ ...... کہ آپ کا دوست آیا اور اس نے میرا دوپٹہ کھینچا اور ..... اور میرے کرتے کے بٹن کھول کر "

اس کے کرتے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔

"جانے دو شاردا۔ بھول جاؤ جو کچھ ہوا۔" میں نے جیب سے رومال نکالا اور اس کے آنسو پونچھنے شروع کئے۔

دوپٹے کا کونہ ابھی تک اس کے منہ میں تھا بلکہ اس نے کچھ اور زیادہ اندر چبا لیا تھا۔ میں نے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اس گیلے حصے کو اس نے اپنی انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے بڑے دکھ سے کہا "آپ کے دوست نے ودھوا سمجھ کر ہی مجھ پر ہاتھ ڈالا تھا —— سوچا ہوگا اس عورت کا کون ہے ؟"

"نہیں نہیں شاردا نہیں "۔ میں نے اس کا سر اپنے کندھے کے ساتھ لگا لیا۔ جو کچھ اس نے سوچا، جو کچھ اس نے کیا لعنت بھیجو اس پہ چپ ہو جاؤ ——"

جی چاہا لوری دے کر اس کو سلا دوں۔

میں نے اس کی آنکھیں خشک کی تھیں لیکن آنسو پھر ابل آئے تھے۔ دوپٹے کا کونہ جو اس نے بھر منہ میں چبا لیا تھا نکال کر میں نے انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے اور دونوں آنکھوں کو ہولے ہولے چوم لیا۔

"بس اب نہیں رونا۔"

شاردا نے اپنا سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے دھیرے دھیرے اس کے گال تھپکائے "بس، بس، بس، !"

تھوڑی دیر کے بعد جب میں نیچے اترا تو مارچ کے آخری دنوں کی خنک ہوائیں، سُشہ نشین کی مرمریں سِل پر، اصغری بیہودگی کو بھول کر، شاردا اپنا ململ کا دوپٹہ تانے خود کو بالکل ہلکی محسوس کر رہی تھی ــــــ اس کے سینے میں تلاطم کے بجائے اب شیر گرم سکون تھا۔

~ ~ ~

چُغد

لڑکوں اور لڑکیوں کے معاشقوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ پرکاش جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا اندر ہی اندر بہت شدت سے سوچ رہا تھا۔ ایک دم پھٹ پڑا "سب بکواس ہے۔ سو میں سے ننانوے معاشقے نہایت ہی بھونڈے۔ لچر اور بے ہودہ طریقوں سے عمل میں آتے ہیں۔ ایک باقی رہ جاتا ہے۔ اس میں آپ اپنی شاعری رکھ لیجئے یا اپنی ذہانت اور ذکاوت بھر دیجئے ——— مجھے حیرت ہے ——— تم سب تجربہ کار ہو —— اوسط آدمی کے مقابلے میں زیادہ سمجھدار ہو۔ جو حقیقت ہے تمہاری آنکھوں سے اوجھل بھی نہیں۔ پھر یہ کیا حماقت ہے کہ تم برابر اس بات پر زور دیئے جا رہے ہو کہ عورت کو راغب کرنے کے لئے نرم و نازک شاعری، حسین جمیل شکل۔ خوش وضع لباس، عطر، لونڈر اور جانے کن کن خرافات

کی ضرورت ہے اور میری سمجھ سے یہ چیز تو بالکل بالاتر ہے کہ عورت سے عشق لڑانے سے پہلے تمام پہلو سوچ کر ایک اسکیم بنانے کی کیا ضرورت ہے "
چودھری نے جواب دیا " ہر کام کرنے سے پہلے آدمی کو سوچنا پڑتا ہے "
پرکاش نے فوراً ہی کہا " مانتا ہوں۔ لیکن یہ عشق لڑانا میرے نزدیک بالکل کام نہیں — یہ ایک ... یہ ایک ..... بھئی تم غور کیوں نہیں کرتے کہانی لکھنا ایک کام ہے۔ اسے شروع کرنے سے پہلے سوچنا ضروری ہے۔ لیکن عشق کو آپ کام کیسے کہہ سکتے ہیں — یہ ایک ..... یہ ایک — میرا مطلب ہے۔ عشق مکان بنانا نہیں جو آپ کو پہلے نقشہ بنوانا پڑے ایک لڑکی یا عورت اچانک آپ کے سامنے آتی ہے آپ کے دل میں کچھ گڑبڑ سی ہوتی ہے پھر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ آپ کے ساتھ لیٹی ہو۔ اسے آپ کام کہتے ہیں ؟ —— یہ ایک —— یہ ایک حیوانی طلب ہے جسے پورا کرنے کے لئے حیوانی طریقے ہی استعمال کرنے چاہئیں۔ جب ایک کتا کتیا سے عشق لڑانا چاہتا ہے تو وہ بیٹھ کر اسکیم تیار نہیں کرتا۔ اسی طرح سانڈ جب بُو سونگھ کر گائے کے پاس جاتا ہے۔ تو اُسے بدن پر عطر لگانا نہیں پڑتا —— بنیادی طور پر ہم سب حیوان ہیں۔ اس لئے عشق و محبت میں جو دنیا کی سب سے پرانی طلب ہے انسانیت کا زیادہ دخل نہیں ہونا چاہیئے "
میں نے کہا " تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ شعر و شاعری۔ مصوری۔ صنم تراشی یہ سب فنونِ لطیفہ محض بیکار ہیں "
پرکاش نے سگریٹ سلگایا اور اپنا جوش بقدرِ کفایت استعمال کرتے ہوئے کہا " محض بیکار نہیں —— میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو، تمہارا مطلب یہ تھا کہ فنونِ لطیفہ کے وجود کی باعث عورت ہے پھر یہ بیکار

کیسے ہوئے ——— اصل بات یہ ہے کہ ان کے وجود کا باعث خود عورت نہیں ہے بلکہ مرد کی عورت سے متعلق حد سے بڑھی ہوئی خوش فہمی ہے مرد جب عورت کے متعلق سوچتا ہے تو اور سب کچھ بھول جاتا ہے وہ چاہتا ہے کہ عورت کو عورت نہ سمجھے ——— عورت کو محض عورت سمجھنے سے اُس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ اُسے خوبصورت سے خوبصورت روپ میں دیکھے۔ یورپی ممالک میں جہاں عورتیں فیشن کی دلدادہ ہیں ان سے جا کر پوچھو کہ ان کے بالوں، ان کے کپڑوں۔ ان کے جوتوں کے نت نئے فیشن کون ایجاد کرتا ہے؟"

چودھری نے اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں پرکاش کے کاندھے پر ہولے سے طمانچہ مارا "تم بہک گئے ہو یار ——— جوتوں کے ڈیزائن کون بناتا ہے۔ سانڈ گائے کے پاس جاتا ہے تو اُسے لونڈر لگانا نہیں پڑتا۔ یہاں باتیں ہو رہی تھیں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے وہی رومان کامیاب ہوتے ہیں جو شریفانہ خطوط پر شروع ہوں"

پرکاش کے ہونٹوں کے کونے طنز سے سکڑ گئے "چودھری صاحب قبلہ آپ بالکل بکواس کرتے ہیں۔ شرافت کو رکھئے آپ اپنے سگریٹ کے ڈبے میں اور ایمان سے کہئے وہ لونڈیا جس کے لئے آپ پورا ایک برس رومالوں کو بہتر سے بہتر لونڈر لگا کر اسکیمیں بناتے رہے کیا آپ کو مل گئی تھی۔؟"

چودھری نے کسی قدر کھسیانہ ہو کر جواب دیا "نہیں"

"کیوں؟"

"وہ ——— وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی"

"کس سے ——"

"ایک اُلّو کے پٹھے سے —— ایک پھیری والے بزاز سے جس کو نہ تو غالب کے شعر یاد تھے نہ کرشن چندر کے افسانے جو آپ کے مقابلے میں لونڈر لگے رومال سے نہیں بلکہ اپنے میلے تہمد سے ناک صاف کرتا تھا۔" پرکاش ہنسا "چودھری صاحب قبلہ مجھے اچھی طرح یاد ہے آپ بڑی محنت سے اُسے خط لکھا کرتے تھے۔ ان میں آسمان کے تمام تارے نوچ کر آپ نے چیپک دیئے چاند کی ساری چاندنی سمیٹ کر ان میں پھیلادی مگر اس پھیری والے بزاز نے آپ کی لونڈیا کو جس کی ذہنی رفعت کے آپ ہر وقت گیت گاتے تھے جس کی نفاست پسند طبیعت پر آپ مرمٹے تھے۔ ایک آنکھ مار کر اپنے تھانوں کی گٹھڑی میں باندھا اور چلتا بنا —— اس کا جواب ہے۔ آپ کے پاس؟"

چودھری منمنایا "میرا خیال ہے جن خطوط پر میں چل رہا تھا غلط تھے اس کا نفسیاتی مطالعہ بھی جو میں نے کیا تھا درست ثابت نہ ہوا۔"

پرکاش مسکرایا "چودھری صاحب قبلہ۔ جن خطوط پر آپ چل رہے تھے یقیناً غلط تھے۔ اس کا نفسیاتی مطالعہ بھی جو آپ نے کیا تھا۔ سو فیصدی نادرست تھا۔ اور جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ کو خط کشی اور نفسیاتی مطالعے کی زحمت اٹھانی ہی نہیں چاہیئے تھی —— نوٹ بک نکال کر اس میں لکھ لیجئے کہ سو میں سے سو مکھیاں شہد کی طرف بھاگی آئیں گی۔ اور سو میں سے ننانوے لڑکیاں بھونڈے پن سے مائل ہوں گی۔"

پرکاش کے لہجے میں ایک ایسا طنز تھا جس کا رُخ چودھری کی طرف اتنا نہیں تھا جتنا خود پرکاش کی طرف تھا۔

چودھری نے سر کو جنبش دی اور کہا "تمہارا فلسفہ میں کبھی نہیں سمجھ سکتا"

"کوشش کرو اور سمجھو۔ کوئی ایسی مشکل چیز نہیں ہے قصہ یہ ہے کہ ایک آسان بات کو تم نے مشکل بنا دیا ہے۔ تم آرٹسٹ ہو۔ اور نوٹ بک نکال کر یہ بھی لکھ لو کہ آرٹسٹ اول درجے کے بیوقوف ہوتے ہیں مجھے بہت ترس آتا ہے ان پر کم بختوں کی بے وقوفی میں بھی خلوص ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے مسئلے حل کر دیں گے پر جب کسی عورت سے مڈ بھیڑ ہو گی تو جناب ایسے چکر میں پھنس جائیں گے کہ ایک گز دور کھڑی عورت تک پہنچنے کے لئے پشاور کا ٹکٹ لیں گے اور وہاں پہنچ کر سوچیں گے وہ عورت آنکھوں سے اوجھل کیسے ہو گئی۔ چودھری صاحب قبلہ نکالئے اپنی نوٹ بک اور یہ لکھ لیجئے کہ آپ اول درجے کے چغد ہیں۔۔"

چودھری خاموش رہا اور مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ پرکاش چودھری کو آئینہ بنا کر اس میں اپنی شکل دیکھ رہا ہے اور خود کو گالیاں دے رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا "پرکاش! ایسا لگتا ہے چودھری کے بجائے تم اپنے آپ کو گالیاں دے رہے ہو۔"

خلاف توقع اس نے جواب دیا "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو اس لئے کہ میں بھی ایک آرٹسٹ ہوں یعنی میں بھی۔ جب دو اور دو چار بنتے ہیں تو خوش نہیں ہوتا۔ میں بھی قبلہ چودھری صاحب کی طرح امرتسر کی کمپنی باغ میں عورت سے مل کر فرنٹیر میل سے پشاور جاتا ہوں اور وہاں آنکھیں مل مل کر سوچتا ہوں۔ میری محبوبہ غائب کہاں ہو گئی" یہ کہکر پرکاش خوب ہنسا۔ پھر چودھری سے مخاطب ہوا "چودھری صاحب قبلہ ہاتھ ملایئے

ہم دونوں پھسڈی گھوڑے ہیں ـــــــ اس دوڑ میں صرف وہی کامیاب ہوگا جس کے ذہن میں صرف ایک ہی چیز ہو کہ اسے دوڑنا ہے۔ یہ نہیں کہ کام اور وقت کا سوال حل کرنے بیٹھ جاؤ۔ اتنے قدموں میں اتنا فاصلہ طے ہوتا ہے تو اتنے قدموں میں کتنا فاصلہ طے ہوگا۔ عشق جیومیٹری ہے نہ الجبرا بس بکواس ہے، چونکہ بکواس ہے اس لئے اس میں گرفتار ہونے والے کو بکواس ہی سے کام لینی چاہیئے۔"

چودھری نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا "کیا بکواس کرتے ہو۔"

"تو سنو" پرکاشش جم کر بیٹھ گیا "میں تمہیں ایک سچا واقعہ سناتا ہوں ـــــــ میرا ایک دوست ہے۔ میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ دو برس ہوئے وہ ایک ضروری کام سے چمبہ گیا۔ دو روز کے بعد لوٹ کر اسے ڈلہوزی چلا آنا تھا۔ اس کے فوراً بعد امرتسر پہنچنا تھا مگر تین مہینے تک وہ لاپتہ رہا۔ نہ اس نے گھر خط لکھا نہ مجھے۔ جب واپس آیا تو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ تین مہینے چمبہ ہی میں تھا۔ وہاں ایک خوبصورت لڑکی سے اُسے عشق ہو گیا تھا۔"

چودھری نے پوچھا "ناکام رہا ہوگا"

پرکاشش کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پیدا ہوئی "نہیں، نہیں۔ ـــــــ وہ کامیاب رہا۔ زندگی میں اُسے ایک شاندار تجربہ حاصل ہوا۔ تین مہینے وہ چمبہ کی سردیوں میں ٹھٹھرتا اور اس لڑکی سے عشق کرتا رہا۔ واپس ڈلہوزی آنے والا تھا کہ پہاڑی کی ایک پگ ڈنڈی پر اس کا قربال حسینہ سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ تمام کائنات سکڑ کر اس لڑکی میں سما گئی اور وہ لڑکی پھیل کر دلبانہ وسعت اختیار کر گئی ـــــــ اس کو محبت

ہو گئی تھی ـــــ قبلہ چودھری صاحب سنئے ۔ پندرہ دنوں تک متواتر وہ غریب اپنی محبت کو جسم کی تیخ بستہ فضا میں دل کے اندر دبائے چھپ چھپ کر دور سے اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔ مگر اس کے پاس جاکر اس سے ہم کلام ہونے کی ہمت نہ کر سکا ـــــ ہر دن گذرنے پر وہ سوچتا کہ وہ ی کتنی اچھی چیز ہے ـــــ اونچی پہاڑی پر وہ بکریاں چرا رہی ہے ۔ نیچے سڑک پر اس کا دل دھڑک رہا ہے ـــــ آنکھوں کے سامنے یہ شاعرانہ منظر لائیے اور داد دیجئے۔ اس پہاڑی پر عاشق صادق کھڑا ہے ۔ دوسری پہاڑی پر اس کی سیمیں بدن محبوبہ ـــــ درمیان میں شفاف پانی کا نالا بہہ رہا ہے ـــــ سبحان اللہ کیسا دلکش منظر ہے ـــــ چودھری صاحب قبلہ..."

چودھری نے ٹوکا ۔" بکواس مت کرو۔ جو واقعہ ہے اُسے بیان کردو ۔"

پرکاش مسکرایا ۔" تو سنئے ۔ ـــــ پندرہ روز تک میرا دوست عشق کے زبردست حملے کے اثرات دور کرنے میں مصروف رہا اور سوچتا رہا کہ اُسے جلدی واپس چلا جانا چاہئے ۔ ان پندرہ دنوں میں اس نے کاغذ پنسل لے کر تو نہیں لیکن دماغ ہی دماغ میں اس لڑکی سے اپنی محبت کا کئی بار جائزہ لیا ۔ لڑکی کے جسم کی ہر چیز اُسے پسند تھی ۔ لیکن سوال یہ درپیش تھا کہ اسے حاصل کیسے کیا جائے ۔ کیا ایک دم بغیر کسی تعارف کے وہ اس سے باتیں کرنا شروع کردے ؟ ۔ بالکل نہیں ۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا ؟ ـــــ کیوں ہو کیسے نہیں سکتا ؟ ـــــ مگر فرض کرلیا جائے اس نے منہ پھیر لیا ۔ جواب دیئے بغیر اپنی بکریوں کو ہانکتی پاس سے گذر گئی ـــــ جلد بازی کبھی بار آور نہیں ہوتی ـــــ لیکن اس سے بات کئے بغیر اسے حاصل کیسے کیا جاسکتا ہے ؟ ایک طریقہ ہے ۔ وہ یہ کہ اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کی جائے ۔ اس کو

اپنی طرف راغب کیا جائے۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن سوال یہ ہے
راغب کیسے کیا جائے — ہاتھ سے اشارہ — نہیں بالکل پوچ ہے۔
سو قبلہ چودھری صاحب! ہمارا ہیرو ان پندرہ دنوں میں یہی سوچتا رہا۔
سولھویں دن اچانک باؤلی پر اس لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔
ہمارے ہیرو کے دل کی باچھیں کھل گئیں۔ لیکن ٹانگیں کانپنے لگیں —
آپ نے اب ٹانگوں کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ لیکن جب مسکراہٹ کا
خیال آیا تو اپنی ٹانگیں الگ کر دیں اور اس لڑکی کی پنڈلیوں کے متعلق سوچنے
لگا جو اٹھی ہوئی گھگھری میں سے اسے نظر آئی تھیں۔ کتنی سڈول تھیں۔
لیکن وہ دن دور نہیں جب وہ ان پہ بہت آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر سکے گا —
پندرہ دن اور گزر گئے — ادھر وہ مسکرا کر پاس سے گزرتی رہی، اُدھر
ہمارے ہیرو صاحب جوابی مسکراہٹ کی ریہرسل کرتے رہے — سو مہینہ
ہو گیا۔ اور ان کا عشق صرف ہونٹوں ہی پر مسکراتا رہا۔ آخر ایک دن
خود اس لڑکی ہی نے پھر خاموشی توڑی اور بڑی ادا سے ایک سگرٹ
مانگا۔ آپ نے ساری ڈبیہ حوالے کر دی اور گھر آ کر ساری رات کپکپاہٹ
پیدا کرنے والے خواب دیکھتے رہے۔ دوسرے دن ایک آدمی کو ڈلہوزی
بھیجا اور وہاں سے سگرٹوں کے پندرہ پیکٹ منگوا کر ایک چھوٹے سے
لڑکے کے ہاتھ اپنی محبوبہ کو بھجوا دیئے۔ جب اس نے اپنی جھولی میں ڈالے
تو آپ کے دل کو دو کھوڑے بہت مسرت محسوس ہوئی۔ ہوتے ہوتے وہ دن
بھی آ گیا جب دونوں پاس پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے — کیسی باتیں۔
قبلہ چودھری صاحب بتائیے ہمارا ہیرو کیا باتیں کرتا تھا اس سے"
چودھری نے اُس کو اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا "مجھے کیا معلوم"

پرکاش مسکرایا "مجھے معلوم ہے قبیلہ چودھری صاحب — گھر سے چلتے وقت وہ باتوں کی ایک بہت لمبی چوڑی فہرست تیار کرتا تھا. میں اس سے یہ کہوں گا، میں اس سے یہ کہوں گا۔ جب وہ نالے کے پاس کپڑے دھوتی ہوگی تو میں آہستہ آہستہ جا کر اس کی آنکھیں میچ لوں گا۔ پھر اس کی بغلوں میں گدگدی کروں گا۔ لیکن جب اس کے پاس پہنچتا اور آنکھیں میچنے اور گدگدی کرنے کا خیال آتا تو اسے شرم آجاتی — کیا بچپنا ہے! — اور وہ اس سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ جاتا — اور پھر بکریوں کی باتیں کرتا رہتا — کئی دفعہ اسے خیال آیا۔ کب تک یہ بھیڑ بکریاں اس کی محبت چرتی رہیں گی؟ — دو مہینے سے کچھ دن اوپر ہو گئے ہیں اور ابھی تک وہ اس کے ہاتھ تک نہ لگا سکا۔ مگر وہ پھر سوچتا کہ ہاتھ لگائے کیسے؟ کوئی بہانہ تو ڈھونڈنا چاہیئے۔ لیکن پھر اسے خیال آتا۔ بہانے سے ہاتھ لگانا بالکل بکواس ہے۔ لڑکی کی طرف سے اسے خاموش اجازت ملنی چاہیئے کہ وہ اس کے بدن کے جس حصے کو بھی چاہے ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اب خاموش اجازت کا سوال آجاتا — اُسے کیسے پتا چل سکتا ہے کہ اس نے خاموش اجازت دیدی ہے —؟ قبیلہ چودھری صاحب اس کا کھوج لگاتے لگاتے پندرہ دن اور گذر گئے۔"

پرکاش نے سگرٹ سلگایا اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے کہنے لگا۔ اس دوران میں وہ کافی گھل مل گئے تھے۔ لیکن اس کا اثر ہمارے ہیرو کے حق میں برا ہوا۔ دوران گفتگو میں اس نے لڑکی سے اپنے اونچے خاندان کا کئی بار ذکر کیا تھا۔ اپنے اوباش دوستوں کا کئی بار

لعنتیں کھیجی تھیں جو پہاڑی دیہاتوں میں جاکر غریب لڑکیوں کو خراب کرتے تھے۔ کبھی دبی زبان میں کبھی بلند بانگ اپنی تحریف کی تھی۔ اب وہ کیسے اس لڑکی پر اپنی شہوانی خواہش ظاہر کرتا۔ ظاہر تھا کہ معاملہ بہت ٹیڑھا اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ مگر اس کا جذبہ عشق سلامت تھا۔ اس لئے اسے امید تھی کہ ایک روز خود لڑکی ہی اپنا آپ تھالی میں ڈال کر اس کے حوالے کر دے گی —— اس امید میں، چنانچہ کچھ دن اور بیت گئے۔ ایک روز کپڑے دھوتے دھوتے لڑکی نے جس کے ہاتھ صابن سے بھرے ہوئے تھے اس سے کہا: "تمہاری ماچس ختم ہو گئی ہے، میری جیب سے نکال لو" —— یہ جیب عین اس کی چھاتی کے ابھار کے اوپر تھی۔ ہمارا ہیرو جھینپ گیا۔ لڑکی نے کہا "نکالو نا" —— تھوڑی سی ہمت کر کے اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بڑھایا۔ اور دو انگلیاں بڑی احتیاط سے اس کی جیب میں ڈالیں —— ماچس بہت نیچے تھی۔ گھبرایا کہیں اور نہ جا ٹکرائیں۔ چنانچہ باہر نکال لیں اور اپنی خالی ماچس سے تیلی نکال کر سگریٹ سلگایا اور لڑکی سے کہا: "تمہاری جیب سے ماچس پھر کبھی نکالوں گا۔" یہ سن کر لڑکی نے شریر شریر نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ ہمارے ہیرو نے آدھا میدان مار لیا۔ دوسرا آدھا مارنے کے لئے وہ اسکیمیں سوچنے لگا۔

ایک روز صبح سویرے نالے کے اس طرف بیٹھا دوسری طرف بلندی پر اس لڑکی کو بکریاں چراتے دیکھ رہا تھا اور اس کی ابھری ہوئی جیب کے مال پر غور کر رہا تھا کہ نیچے سڑک پر باؤلی کے پاس ایک موٹر لاری رکی۔ سکھ ڈرائیور نے باہر نکل کر پانی پیا اور اوپر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ میرے دل میں

ایک جلن سی پیدا ہوئی۔ باؤلی کے منڈیر پر کھڑے ہو کر اس موبل آئیل سے لتھڑے ہوئے سکھ ڈرائیور نے پھر ایک بار ساوتری کی طرف دیکھا اور اپنا غلیظ ہاتھ اُٹھا کر اُسے اشارہ کیا۔ میرے جی میں آئی پاس پڑا ہوا پتھر اس پر لڑھکا دوں ـــــ اشارہ کرنے کے بعد دونوں ہاتھ منہ کے اِدھر اُدھر رکھ کر نہایت ہی بھونڈے طریقے سے پکارا "اوجانی ـــ میں صدقے ـــ آؤں ؟ " ـــــ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی ـــ سکھ ڈرائیور نے اوپر چڑھنا شروع کیا ـــ میرا دل گھٹنے لگا۔ چند منٹوں ہی میں وہ حرامزادہ اس کے پاس کھڑا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر اس نے کوئی بدتمیزی کی تو وہ چھڑی سے اس کی ایسی مرمت کرے گی کہ ساری عمر یاد رکھے گا ـــ میں اُدھر سے نگاہ ہٹا کر اس مرمت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک دم دونوں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں بھاگا نیچے سڑک کی طرف باؤلی کے پاس پہنچ کر سوچا۔ کیا حماقت ہے۔ تشویش کیسی ؟ لیکن پھر خیال آیا کہیں وہ اُلو کا پٹھا دراز دستی نہ کر بیٹھے اس لئے پہاڑی پر تیزی سے چڑھنا شروع کیا ـــ بڑی مشکل چڑھائی تھی۔ جگہ جگہ خاردار جھاڑیاں تھیں۔ ان کو پکڑ کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ بہت دور اوپر چلا گیا پر وہ دونوں کہیں نظر نہ آئے۔ ہانپتے ہانپتے میں نے اپنے سامنے کی جھاڑی پکڑ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی ـــــ کیا دیکھتا ہوں۔ جھاڑی کے دوسری طرف پتھروں پر ساوتری لیٹی ہے اور اس غلیظ ڈرائیور کی داڑھی اس کے چہرے پر بکھری ہوئی ہے ـــــ میری ـــ میرے جسم کے سارے بال جل گئے ایک کروڑ گالیاں ان دونوں کے لئے میرے دل میں پیدا ہوئیں لیکن ایک لحظے کے لئے سوچا تو محسوس ہوا کہ دنیا کا سب سے بڑا چغد میں ہوں ـــ

—— اُسی وقت نیچے اُترا اور سیدھا لاریوں کے اڈے کا رخ کیا۔"
پرکاش کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں۔

~~~
~~~

پڑھئے کلمہ

لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ـــــــ آپ مسلمان ہیں یقین کریں میں جو کچھ کہوں گا۔ سچ کہوں گا پاکستان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ـــــــ قائداعظم جناح کے لئے میں جان دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں اس معاملے سے پاکستان کا کوئی تعلق نہیں ۔ آپ اتنی جلدی نہ کیجئے ـــــــ مانتا ہوں، ان دنوں ہلڑ کے زمانے میں آپ کو فرصت نہیں۔ لیکن آپ خدا کے لئے میری پوری بات تو سن لیجئے ـــــــ میں نے ترلکا رام کو ضرور مارا ہے اور جیسا کہ آپ کہتے ہیں تیز چھری سے اس کا پیٹ چاک کیا ہے ۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ ہندو تھا ۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تم نے اس لئے نہیں مارا تو پھر کس لئے مارا ـــ لیجئے میں ساری داستان ہی آپ کو سنا دیتا ہوں۔

پڑھئے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ——— کس کافر کو معلوم تھا کہ
میں اس لفڑے میں پھنس جاؤں گا۔ پچھلے ہندو مسلم فساد میں میں نے تین
ہندو مارے تھے۔ لیکن آپ یقین مانئے وہ مارنا کچھ اور ہے یہ مارنا بالکل
کچھ اور ہے۔ خیر آپ سنئے کہ ہوا کیا۔ میں نے اس تکارام کو مارا کیوں؟"
کیوں صاحب عورت ذات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ——— میں تو
سمجھتا ہوں بزرگوں نے ٹھیک کہا ہے ——————— اس کے چلتروں
سے خدا ہی بچائے ——— پھانسی سے بچ گیا تو دیکھئے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں
پھر کبھی کسی عورت کے قریب نہیں جاؤں گا ——— لیکن صاحب عورت
بھی اکیلی قصوروار نہیں۔ مرد سالے بھی کم نہیں ہوتے۔ بس کسی عورت کو دیکھا
اور ریشہ خطمی ہو گئے۔ خدا کو جان دینی ہے ——— انسپکٹر صاحب رکما کو
دیکھ کر میرا بھی یہی حال ہوا تھا۔

اب کوئی مجھ سے پوچھے۔ بندۂ خدا تو ایک پینتیس روپے کا ملازم۔ تجھے
بھلا عشق سے کیا کام۔ کرایہ وصول کر اور چلتا بن۔ لیکن آفت یہ ہوئی صاحب
کہ ایک دن جب میں سولہ نمبر کی کھولی کا کرایہ وصول کرنے گیا۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا
تو اندر سے رکما بائی نکلی۔ یوں تو میں رکما بائی کو کئی دفعہ دیکھ چکا تھا۔ لیکن
اس دن کم بخت نے بدن پر تیل ملا ہوا تھا اور ایک پتلی دھوتی لپیٹ رکھی
تھی۔ جانے کیا ہوا مجھے۔ جی چاہا اس کی دھوتی اتار کر زور زور سے
مالش شروع کر دوں۔ بس صاحب اسی روز سے اس بندۂ نابکار
نے اپنا دل و دماغ سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔

کیا عورت تھی ——— بدن تھا پتھر کی طرح سخت مالش کرتے
کرتے ہانپنے لگ گیا تھا۔ مگر وہ اپنے باپ کی بیٹی یہی کہتی رہی ———

"تھوڑی دیر اور ــــ"

شادی شدہ ـــــــ جی ہاں شادی شدہ تھی اور خان چوکیدار نے کہا تھا۔ کہ اس کا ایک یار بھی ہے۔ لیکن آپ سارا قصہ ہی سن لیجئے ـــــ یار وار سب ہی اس میں آ جائیں گے۔

جی ہاں بس اس روز سے عشق کا بھوت میرے سر پہ سوار ہو گیا۔ وہ بھی کچھ کچھ سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ کبھی کبھی کن اکھیوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی ـــــ لیکن خدا گواہ ہے۔ جب بھی وہ مسکرائی۔ میرے بدن میں خوف کی ایک تھرتھری سے دوڑ گئی۔ پہلے میں سمجھا تھا یہ معشوق کو پاس دیکھنے کا "وہ" ہے ـــــ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا ـــــ لیکن آپ شروع ہی سے سنیئے ـــ۔

وہ تو میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ رکما بائی سے میری آنکھ لڑ گئی تھی۔ اب دن رات یہ سوچتا تھا کہ اسے پٹایا کیسے جائے۔ کم بخت اس کا خاوند ہر وقت کھولی میں بیٹھا لکڑی کے کھلونے بنایا کرتا تھا۔ کوئی چانس ملتا ہی نہیں تھا۔

ایک دن بازار میں میں نے اس کے خاوند کو جس کا نام ـــــ خدا آپ کا بھلا کرے گیا تھا۔ جی ہاں ـــــ گردھاری ـــــ لکڑی کے کھلونے چادر میں باندھے جاتے دیکھا تو میں نے جھٹ سے سولہ نمبر کی کھولی کا رخ کیا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ رکما بائی نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ خدا کی قسم میری روح لرز گئی۔ بھاگ گیا ہوتا وہاں سے۔ لیکن اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا ـــــ

جب اندر گیا تو اس نے کھولی کا دروازہ بند کر کے مجھ سے کہا "بیٹھ جاؤ"
میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے پاس آکر کہا "دیکھو میں جانتی ہوں تم کیا
چاہتے ہو۔ لیکن جب تک گردھاری زندہ ہے تمہاری مراد پوری نہیں
ہو سکتی ۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا —— اسے بالکل پاس دیکھ کر میرا خون گرم
ہو گیا تھا۔ کنپٹیاں ٹھک ٹھک کر رہی تھیں ۔ کم بخت نے آج بھی بدن
پر تیل ملا ہوا تھا اور وہی پتلی دھوتی لپٹی ہوئی تھی ۔ میں نے اسے
بازوؤں سے پکڑ لیا اور دبا کر کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو"
اُف —— اس کے بازوؤں کے پٹھے کس قدر سخت تھے ۔ سچ عرض کرتا ہوں
میں بیان نہیں کر سکتا وہ کس قسم کی عورت تھی ۔

خیر آپ داستان سنیئے ۔

میں اور زیادہ گرم ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا "گردھاری جائے
جہنم میں —— تمہیں میری بننا ہو گا ۔"

رکما نے مجھے اپنے جسم سے الگ کیا اور کہا "دیکھو تیل لگ جائے گا"
میں نے کہا "لگنے دو" اور پھر اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا —— یقین
مانئے اگر اس وقت آپ مارے کوڑوں کے میری پیٹھ کی چمڑی ادھیڑ دیتے۔ تب
بھی میں اسے علیحدہ نہ کرتا۔ لیکن کم بخت نے کچھ ایسا پچکارا کہ جہاں اس
نے مجھے پہلے بٹھایا تھا۔ خاموش ہو کر بیٹھ گیا ۔ مجھے معلوم نہیں تھا ۔ وہ
سوچ کیا رہی ہے —— گردھاری سالا باہر ہے ڈر کس بات کا ۔
تھوڑی دیر کے بعد جب مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے اس سے کہا "رکما ۔
ایسا اچھا موقعہ پھر کبھی نہیں ملے گا " اس نے بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ

پھیرا اور مسکرا کر کہا "اس سے بھی اچھا موقعہ ملے گا ــــ لیکن تم یہ بتاؤ ـ جو کچھ میں کہوں گی کرو گے" ــــ صاحب میرے سر پہ تو بھوت سوار تھا میں نے جوش میں آ کر کہا "تمہارے لئے میں پندرہ آدمی قتل کرنے کو تیار ہوں" یہ سن کر وہ مسکرائی۔ "مجھے وشواس ہے" خدا کی قسم ایک بار پھر میری روح لرز گئی۔ لیکن میں نے سوچا شاید زیادہ جوش آنے پر ایسا ہوا ہے۔

بس وہاں میں تھوڑی دیر اور بیٹھا۔ محبت اور پیار کی باتیں کیں۔ اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے بھجئے کھائے اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ گو وہ سلسلہ نہ ہوا لیکن صاحب ایسے سلسلے پہلے ہی دن تھوڑے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا پھر سہی۔

دس دن گذر گئے۔ ٹھیک گیارہویں دن، رات کے دو بجے۔ جی ہاں دو ہی کا عمل تھا ــــ کسی نے مجھے آہستہ سے جگایا۔ میں نیچے سیڑھیوں کے پاس جو جگہ ہے نا۔ وہاں سوتا ہوں۔ آنکھیں کھول کر میں نے دیکھا۔ ارے رکما بائی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا "کیا ہے"؟ اس نے ہولے سے کہا "آؤ میرے ساتھ" ــــ میں ننگے پاؤں اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے کھولی کا دروازہ کھولا۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے بالکل اندھیرا تھا۔ میں نے اور کچھ نہ سوچا اور وہیں کھڑے کھڑے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس نے میرے کان میں کہا "ابھی ٹھہرو" پھر بتی روشن کی میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے چٹائی پر کوئی سو رہا ہے۔ منہ پر کپڑا ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا "یہ کیا ہے"؟ رکما نے کہا "بیٹھ جاؤ" میں الّو کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آئی اور بڑے پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر اس نے ایسی بات کہی جس کو سنکر

میرے اوسان خطا ہو گئے ـــــ بالکل برف ہو گیا صاحب ـــ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ـــــ جانتے ہیں دکمانے مجھ سے کیا کہا ـــ
پڑھیئے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ـــــ میں نے اپنی زندگی میں ایسی عورت نہیں دیکھی ـــــ کم بخت نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا ـــــ " میں نے گردھاری کو مار ڈالا ہے " ـــــ آپ یقین کیجئے اُس نے اپنے ہاتھوں سے ایک بیٹے کٹے آدمی کو قتل کیا تھا ـــــ کیا عورت تھی صاحب ـــــ مجھے جب بھی وہ رات یاد آتی ہے - قسم خدا کی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ـــــ اس نے مجھے وہ چیز دکھائی جس سے اس ظالم نے گردھاری کا گلا گھونٹا تھا - بجلی کے تاروں کی گندھی ہوئی ایک مضبوط رسی سی تھی - لکڑی پھنسا کر اس نے زور سے کچھ ایسے پیچ دیئے تھے کہ بے چارے کی زبان اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں ـــــ کہتی تھی بس یوں چٹکیوں میں کام تمام ہو گیا تھا -
کپڑا اٹھا کر جب اس نے گردھاری کی شکل دکھائی تو میری ہڈیاں تک برف ہو گئیں - لیکن وہ عورت جانے کیا تھی - وہیں لاش کے سامنے اس نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا - قرآن کی قسم میرا خیال تھا کہ ساری عمر کے لئے نامرد ہو گیا ہوں - مگر صاحب جب اس کا گرم گرم بدن میرے بدن کے ساتھ لگا اور اس نے ایک عجیب و غریب قسم کا پیار کیا تو اللہ جانتا ہے چودہ طبق روشن ہو گئے ـــــ زندگی بھر وہ رات مجھے یاد رہے گی ـــــ سامنے لاش پڑی تھی لیکن رکما اور میں دونوں اس سے غافل ایک دوسرے کے اندر دھنسے ہوئے تھے -
صبح ہوئی تو ہم دونوں نے مل کر گردھاری کی لاش کے تین ٹکڑے کئے

اوزار اس کے موجود تھے اس لئے زیادہ تکلیف نہ ہوئی۔ ٹھوک ٹھاک کافی ہوئی تھی پر لوگوں نے سمجھا ہو گا کہ دھاندری کھلونے بنا رہا ہے ـــــ آپ پوچھیں گے بندۂ خدا تم نے ایسے گھناؤنے کام میں کیوں حصہ لیا۔ پولیس میں رپٹ کیوں نہ لکھوائی ـــــ صاحب عرض یہ ہے کہ اس کم بخت نے مجھے ایک ہی رات میں اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے کہتی تو شاید میں نے پندرہ آدمیوں کا خون بھی کر ہی دیا ہوتا۔ یاد ہے نا میں نے ایک دفعہ جوش میں آکر کہا تھا ـــــ ؟

اب مصیبت یہ تھی کہ لاش کو ٹھکانے کیسے لگایا جائے۔ دکھا کچھ بھی ہو آخر عورت ذات تھی۔ میں نے اس سے کہا جانِ من تم کچھ فکر نہ کرو۔ فی الحال ان ٹکڑوں کو ٹرنک میں بند کر دیتے ہیں۔ جب رات آئے گی تو میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا صاحب کہ اس روز بلڑ ہوا۔ پانچ چھ علاقوں میں کرفیو لگا دیا گیا۔ میں نے کہا عبدالکریم کچھ بھی ہو لاش آج ہی ٹھکانے لگا دو ـــــ چھتیس گھنٹے کا کرفیو لگا تھا۔

ـــــ چنانچہ دو بجے اٹھا ـــــ اوپر سے ٹرنک لیا۔

خدا کی پناہ۔ کتنا وزن تھا ـــ مجھے ڈر تھا رستے میں کوئی پیلی پگڑی والا ضرور ملے گا۔ اور کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی میں دھر لے گا۔ مگر صاحب جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ جس بازار سے گزرا۔ اس میں سناٹا تھا ایک جگہ ـــــ بازار کے پاس مجھے ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ میں نے ٹرنک کھولا اور لاش کے ٹکڑے نکال کر اندر ڈیوڑھی میں ڈال دیئے اور واپس چلا آیا۔

قربان اس کی قدرت کے صبح پتہ چلا کہ ہندوؤں نے اس مسجد کو

آگ لگا دی۔ میرا خیال ہے گردھاری اس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گیا ہوگا کیونکہ اخباروں میں کسی لاش کا ذکر نہیں تھا۔ اب صاحب بقول شخصے میدان خالی تھا۔ میں نے رکما سے کہا۔ چالی میں مشہور کردو کہ گردھاری باہر کام پر گیا ہے۔ میں رات کو دو ڈھائی بجے آجایا کروں گا اور عیش کیا کریں گے۔ — مگر اس نے کہا نہیں عبدل اتنی جلدی نہیں۔ ابھی ہم کو کم ازکم پندرہ بیس روز تک نہیں ملنا چاہیئے۔ بات معقول تھی اس لئے میں خاموش رہا۔

سترہ روز گزر گئے ——— کئی بار ڈراؤنے ڈراؤنے خوابوں میں گردھاری آیا لیکن میں نے کہا۔ سالے مر کھپ چکا ہے۔ اب میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اٹھارویں روز صاحب میں اسی طرح سیڑھیوں کے پاس چارپائی پر سو رہا تھا کہ رکما رات کے بارہ ——— بارہ نہیں تو ایک ہوگا۔ آئی اور مجھے اوپر لے گئی۔

چٹائی پر ننگی لیٹ کر اس نے مجھ سے کہا: عبدل میرا بدن دکھ رہا ہے۔ ذرا چمپی کردو۔" میں نے فوراً تیل لیا اور مالش کرنے لگا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں ہانپنے لگا۔ میرے پسینے کی کئی بوندیں اس کے چکنے بدن پر گریں لیکن اس نے یہ نہ کہا۔ بس کرو عبدل، تم تھک گئے ہو آخر،" مجھے ہی کہنا پڑا۔" رکما بھئی اب خلاص ———" وہ مسکرائی ——— میرے خدا کیا مسکراہٹ تھی ——— تھوڑی دیر دم لینے کے بعد میں چٹائی پر بیٹھ گیا اس نے اٹھ کر بتی بجھادی اور میرے ساتھ لیٹ گئی۔ چمپی کر کرکے میں اسقدر تھک گیا تھا کہ کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ رکما کے سینے پر ہاتھ رکھا اور سو گیا۔

جانے کیا بجا تھا — میں ایک دم ہڑبڑا کر اٹھا۔ گردن میں کوئی سخت سخت سی چیز دھنس رہی تھی۔ فوراً مجھے اس تار والی رسی کا خیال آیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرسکوں

رکما میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ ایک دو ایسے مروڑے دیئے کہ میری گردن کڑکڑ بول اٹھی۔ میں نے شور مچانا چاہا۔ لیکن آواز میرے پیٹ ہی میں رہی۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

میرا خیال ہے چار بجے ہوں گے آہستہ آہستہ مجھے ہوش آنا شروع ہوا۔ گردن میں بہت زور کا درد تھا۔ میں ویسے ہی دم سادھے پڑا رہا۔ ٹٹولتے ہوئے ہاتھ سے رسی کے مروڑے کھولنا شروع کئے —— ایک دم آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سانس روک لیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی پر کچھ نظر نہ آیا۔ جو آوازیں آ رہی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا دو آدمی کشتی لڑ رہے ہیں۔ رکما ہانپ رہی تھی —— ہانپتے ہانپتے اس نے کہا: "تکارام۔ بتی جلا دو۔"

تکارام نے ڈرتے ہوئے لہجے میں کہا: "نہیں نہیں رکما نہیں —"

رکما بولی: "بڑے ڈرپوک ہو —— صبح اس کے تین ٹکڑے کر کے لے جاؤ گے کیسے —" میرا بدن بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ تکارام نے کیا جواب دیا —— رکما نے پھر کیا کہا۔ اس کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ پتہ نہیں کب۔ ایک دم روشنی ہوئی اور میں آنکھیں جھپکتا اٹھ بیٹھا۔ تکارام کے منہ سے زور کی چیخ نکلی اور وہ دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔ رکما نے جلدی سے کواڑ بند کئے اور کنڈی چڑھا دی —— صاحب میں آپ سے کیا بیان کروں میری حالت کیا تھی —— آنکھیں کھلی تھیں۔ دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا لیکن ہلنے جلنے کی بالکل سکت نہیں تھی۔

یہ تکارام میرے لئے کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ ہماری چالی میں اکثر آم بیچنے آیا کرتا تھا۔ رکما نے اس کو کیسے پھنسایا اس کا مجھے علم نہیں —

رکما میری طرف گھور گھور کے دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ۔ وہ مجھے مار چکی تھی، لیکن میں اس کے سامنے زندہ بیٹھا تھا ۔ وہ مجھ پر جھپٹنے کو تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور بہت سے آدمیوں کی آوازیں آئیں ۔ رکما نے جھٹ سے میرا بازو پکڑا اور گھسیٹ کر مجھے غسل خانے کے اندر ڈال دیا ۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھولا ۔ پڑوس کے آدمی تھے ۔ انھوں نے رکما سے پوچھا "خیر نیت ہے ۔ ابھی ابھی ہم نے چیخ کی آواز سنی تھی ۔۔ رکما نے جواب دیا "میری تھی ۔ مجھے سوتے میں چلنے کی عادت ہے ——— دروازہ کھول کر باہر نکلی تو دیوار کے ساتھ ٹکرا گئی اور ڈر کر منہ سے چیخ نکل گئی "، پڑوس کے آدمی یہ سن کر چلے گئے ۔ رکما نے کواڑ بند کیے اور کنڈی چڑھا دی ——— اب مجھے اپنی جان کی فکر ہوئی ۔ آپ یقین مانئے یہ سوچ کر کہ وہ ظالم مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی ۔ ایک دم میرے اندر مقابلے کی بے پناہ طاقت آگئی ۔ بلکہ میں نے ارادہ کر لیا کہ رکما کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا ۔ غسل خانے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ بڑی کھڑکی کے پٹ کھولے باہر جھانک رہی ہے ۔ میں ایک دم لپکا ۔ چوتڑوں پر سے اوپر اٹھایا اور باہر دھکیل دیا ۔ یہ سب یوں چٹکیوں میں ہوا ۔ دھب سی آواز آئی اور میں دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا ۔ ساری رات میں چارپائی پر لیٹا اپنی گردن پہ جو بری طرح زخمی ہو رہی تھی ——— آپ نشان دیکھ سکتے ہیں ۔ تیل مل مل کر سوچتا رہا کہ کسی کو پتہ نہیں چلے ——— اس نے پڑوسیوں سے کہا تھا کہ اسے سوتے میں چلنے کی عادت ہے ——— مکان کے اس طرف جہاں میں نے اسے گرایا تھا ۔ جب اس کی لاش دیکھی جائے گی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ سوتے میں چلی ہے اور کھڑکی سے باہر گر پڑی ہے ——— خدا خدا کر کے صبح ہوئی

گردن پر میں نے رومال باندھ لیا تھا تاکہ زخم دکھائی نہ دیں۔ تو بج گئے۔ بارہ ہو گئے مگر رکما کی لاش کی کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ جدھر میں نے اس کو گرایا تھا ایک تنگ گلی ہے دو بلند بلڈنگوں کے درمیان۔ دونوں طرف دروازے ہیں تاکہ لوگ اندر داخل ہو کر پیشاب پاخانہ نہ کریں۔ پھر بھی دونوں بلڈنگوں کی کھڑکیوں میں سے پھینکا ہوا کچرا کافی جمع ہو جاتا ہے جو ہر روز صبح سویرے بھنگن اٹھا کر لے جاتی ہے۔ میں نے سوچا شاید بھنگن نہیں آئی۔ آئی ہوتی تو اس نے دروازہ کھولتے ہی رکما کی لاش دیکھی ہوتی اور شور برپا کر دیا ہوتا۔ قصہ کیا تھا؟ میں چاہتا تھا کہ لوگوں کو جلدی اس بات کا پتہ چلے — دو بج گئے تو میں نے ہی کڑا کر کے خود ہی دروازہ کھولا۔ لاش تھی نہ کچرا۔ یا مظہر العجائب رکما گئی کہاں؟ — قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے اس پھانسی کے پھندے سے بچ نکلنے کا اتنا تعجب نہیں ہوگا جتنا کہ رکما کے غائب ہونے کا ہے۔ تیسری منزل سے میں نے اسے نیچے گرایا تھا۔ پتھروں کے فرش پر بچی کیسے ہوگی — لیکن پھر سوال ہے کہ اس کی لاش کون اٹھا کر لے گیا — عقل نہیں مانتی۔ لیکن صاحب کچھ پتہ نہیں وہ ڈائن زندہ ہی ہو — چالی میں تو یہی مشہور ہے کہ یا تو کسی مسلمان نے گھر ڈال لیا ہے یا مار ڈالا ہے — واللہ اعلم بالصواب — مار ڈالا ہے تو اچھا کیا ہے — گھر ڈال لیا ہے تو پھر اس غریب کا ہوگا۔ آپ جانتے ہی ہیں — خدا بچائے صاحب۔

اب تکا رام کی بابت سنئے۔ اس واقعے کے ٹھیک بیس روز بعد وہ مجھ سے ملا اور پوچھنے لگا۔ "بتاؤ رکما کہاں ہے۔؟" میں نے کہا "مجھے کچھ علم نہیں۔" کہنے لگا "نہیں تم جانتے ہو۔" میں نے جواب دیا

"بھائی قرآن مجید کی قسم مجھے کچھ معلوم نہیں ٹ ـــــ بولا " نہیں تم جھوٹ بولتے ہو ۔ تم نے اسے مار ڈالا ہے ۔ میں پولیس میں رپورٹ لکھوانے والا ہوں کہ پہلے تم نے گردھاری کو مارا پھر رکما کو ۔" یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا ۔ لیکن صاحب میرے پسینے چھوٹ گئے ۔ بہت دیر تک کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں ۔ ایک ہی بات سوجھی کہ اس کو ٹھکانے لگا دوں ـــــ آپ ہی سوچئے اس کے علاوہ اور علاج بھی کیا تھا ـــــ چنانچہ صاحب اسی وقت چھپ کر چھری تیز کی اور تکا رام کو ڈھونڈنے نکل پڑا ـــــ اتفاق کی بات ہے شام کو جھٹپٹے وہ مجھے ـــــ اسٹریٹ کے ناکے پر موتری کے پاس مل گیا ۔ میسیوں کی خالی ٹوکری باہر رکھ کر وہ پیشاب کرنے کے لئے اندر گیا ۔ میں بھی لپک کر اس کے پیچھے ۔ دھوتی کھول ہی رہا تھا کہ میں نے زور سے پکارا " تکا رام " ـــــ پلٹ کر اس نے میری طرف دیکھا ۔ چھری میرے ہاتھ ہی میں تھی ـــــ ایک دم اس کے پیٹ میں بھونک دی ـــــ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی باہر نکلتی ہوئی انتڑیاں تھامیں اور دوہرا ہو کر گر پڑا ـــــ چاہئے تو یہ تھا کہ باہر نکل کر نو دو گیارہ ہو جاتا مگر میری بے وقوفی دیکھئے بیٹھ کر اس کی نبض دیکھنے لگا کہ آیا مرا ہے یا نہیں ۔ میں نے اتنا سنا تھا کہ نبض ہوتی ہے انگوٹھے کی طرف یا دوسری طرف یہ مجھے معلوم نہیں تھا ۔ چنانچہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر لگ گئی اتنے میں ایک کنسٹیبل پتلون کے بٹن کھولتے کھولتے اندر آیا اور میں دھر لیا گیا ـــــ بس صاحب یہ ہے پوری داستان ـــــ بڑھئے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ جو میں نے رتی بھر بھی جھوٹ بولا ہو ـــ

~ ❋ ~

مس ٹین والا

اپنے سفید جوتوں پر پالش کر رہا تھا کہ میری بیوی نے کہا "زیدی صاحب آئے ہیں "

میں نے جوتے اپنی بیوی کے حوالے کئے اور ہاتھ دھو کر دوسرے کمرے میں چلا آیا جہاں زیدی بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"ارے کیا ہو گیا ہے تمہیں "؟

زیدی نے اپنے چہرے کو شگفتہ بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا " بیمار رہوں ۔"

میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا " بہت دبلے ہو گئے ہو یار۔ میں نے تو پہلے پہچانا ہی نہیں تھا تمہیں ——— کیا بیماری تھی ؟"

"معلوم نہیں ۔"

"کیا مطلب ؟"

زیدی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا بیماری ہے "

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم ابھی تک بیمار ہو "

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے "

"کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا تھا"

زیدی خاموش رہا ۔ تو میں نے پھر اس سے کہا "کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ لیا ؟"

"نہیں ۔"

"کیوں ؟"

زیدی پھر خاموش رہا ۔ جواب دینے کے بجائے اس نے جیب سے سگرٹ کیس نکالا ۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں "میرا خیال ہے زیدی تمہارا نروس سسٹم خراب ہو گیا ہے ۔ وٹامن بی کے انجکشن لگوانا شروع کر دو ۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے ۔ پچھلے برس زیادہ وسکی پینے سے میرا یہی حال ہو گیا تھا لیکن بارہ انجکشن لینے سے کمزوری دور ہو گئی تھی مگر تم کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کیوں نہیں لیتے ؟"

زیدی نے اپنا چشمہ اتار کر رومال سے صاف کرنا شروع کر دیا ۔ اسکی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے ۔ میں نے پوچھا "کیا رات کو نیند نہیں آتی ؟"

"بہت کم ۔"

"دماغ میں خشکی ہو گی "

"جانے کیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا: "دیکھو سعادت میں تمہیں ایک عجیب و غریب بات بتانے آیا ہوں۔ مجھے بیماری ویماری کچھ نہیں۔ رات کو نیند اس لئے نہیں آتی کہ میں ڈرتا رہتا ہوں۔"

"ڈرتے رہتے ہو ـــــ کیوں؟"

"بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کانپتے ہاتھوں سے سگرٹ سلگایا اور بجھی ہوئی تیلی کو توڑنا شروع کر دیا۔ "مجھے معلوم نہیں سن کر تم کیا کہو گے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ میں ڈرتا ہوں اور وہ بھی ایک بلے سے۔"

"بلے سے"

میں شاید مسکرا دیا تھا کیونکہ زیدی نے فوراً ہی بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "ہنسو نہیں ـــــ یہ حقیقت ہے۔ میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ انسانی نفسیات سے تمہیں کافی دلچسپی ہے۔ شاید تمہیں میرے ڈر کی وجہ بتا سکو۔"

میں نے کہا "لیکن یہاں تو سوال ایک حیوان کا ہے۔"

زیدی خفا ہو گیا: "تم مذاق اڑاتے ہو تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"نہیں نہیں زیدی مجھے معاف کر دو۔ میں پوری توجہ سے سنوں گا جو تم کہو گے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور نیا سگرٹ سلگانے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا: "تمہیں معلوم ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ دو کمرے ہیں پہلے کمرے کے اس طرف چھوٹی سی بالکنی ہے جس کے کٹہرے میں لوہے کی سلاخیں لگی ہیں۔ اپریل اور مئی کے دو مہینے چونکہ بہت گرم ہوتے ہیں اس لئے فرش پر بستر بچھا کر میں اس بالکنی ہی میں سویا کرتا ہوں ـــــ

—— یہ جون کا مہینہ ہے۔ اپریل کی بات ہے۔ میں صبح ناشتہ سے فارغ ہوکر دفتر جانے کے لئے باہر نکلا۔ دروازہ کھولا۔ تو دہلیز کے پاس ایک موٹا بلّا آنکھیں بند کئے لیٹا نظر آیا۔ میں نے جوتے سے اُسے ٹھوکا دیا۔ اُس نے ایک لحظے کے لئے آنکھیں کھولیں۔ میری طرف بڑی بے پروائی سے، جیسے میں کچھ بھی نہیں۔ دیکھا اور بند کرلیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ چنانچہ میں نے بڑے زور سے اس کے ٹھوکر ماری۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ میری طرف پھر اُسی نظر سے دیکھا اور اٹھ کر کچھ دور سیڑھیوں کے پاس لیٹ گیا۔ جس انداز سے اُس نے چند قدم اٹھائے تھے اُس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے بالکل مرعوب نہیں ہوا۔ مجھے سخت غصّہ آیا۔ آگے بڑھ کر اب کی میں نے زور سے ٹھوکر ماری دس پندرہ زینوں پر وہ لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ جب چار پیروں پر سنبھلا تو اس نے نیچے سے اپنی پیلی پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کوئی آواز پیدا کئے بغیر ایک طرف چلا گیا —— تم دلچسپی لے رہے ہو یا نہیں —— "

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں —"

زیدی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور سلسلۂ کلام جاری کیا "دفتر پہنچ کر میں سب کچھ بھول گیا۔ لیکن شام کو جب گھر لوٹا اور کمرے کی دہلیز کے پاس پہنچا جہاں وہ بلّا لیٹا ہوا تھا تو صبح کا واقعہ دماغ میں تازہ ہوگیا۔ نہاتے۔ چائے پیتے۔ رات کا کھانا کھاتے کئی دفعہ میں نے سوچا۔ تین دفعہ میں نے اس کی پسلیوں میں زور سے ٹھوکر ماری مجھ سے وہ ڈرا کیوں نہیں؟ میاؤں تک نہ کی اُس نے؟ اور پھر کیا انداز تھا اس کے چلنے، آنکھیں بند کرنے اور کھولنے کا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُسے کچھ پروا ہی نہیں۔ جب میں

ضرورت سے زیادہ اس بلّے کے بارے میں سوچنے لگا تو بڑی الجھن ہوئی -
ایک معمولی سے حیوان کو اتنی اہمیت آخر کیوں دے رہا تھا؟ اس کا جواب
نہ مجھے اس وقت ملا اور نہ اب - حالانکہ پورے تین مہینے گذر چکے ہیں "
اس قدر کہہ کر زیدی خاموش ہو گیا - میں نے پوچھا "بس ؟"
" نہیں ـــ" زیدی نے سگرٹ کو ایش ٹرے پر رکھتے ہوئے کہا "میں
صرف تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ اس بلّے کو میں نے اتنی اہمیت کیوں دی ہے
میں اتنا خوف کیوں کھاتا ہوں - یہ معمہ ابھی تک مجھ سے حل نہیں ہو سکا
شاید تم مجھ سے بہتر سوچ سکو "
میں نے کہا " مجھے پورے واقعات معلوم ہونے چاہئیں ـ "
زیدی نے ایش ٹرے پر سے سگرٹ اٹھایا اور ایک کش لے کر کہا -
"میں بتا رہا ہوں " اس روز کے بعد کئی دن گذر گئے مگر وہ بلّا نظر نہ آیا -
شاید ہفتے کی رات تھی - میں باہر بالکنی میں سو رہا تھا - دو بجے کے قریب
کمرے میں کچھ شور ہوا - جس سے میری آنکھ کھل گئی - اٹھ کر روشنی کی تو
میں نے دیکھا وہی بلّا کھانے والی میز پر کھڑا ڈش کا سرپوش اتار کر
پڈنگ کھا رہا ہے - میں نے شش شش کی مگر وہ اپنے کام میں مصروف
رہا میری طرف اس نے بالکل نہ دیکھا - میں نے چپل کا ایک پیرا اٹھایا -
اور نشانہ تان کر زور سے مارا - چپل اس کے پیٹ پر لگا - مگر وہ اس
چوٹ سے بے پرواہ پڈنگ کھاتا رہا - میں نے غصے میں آکر مسہری کا
ڈنڈا اٹھایا اور پاس جا کر اس کی پیٹھ پر مارا اس نے اور زیادہ
بے پروائی سے میری طرف دیکھا - بڑے آرام سے کرسی پر کودا - آواز
پیدا کئے بغیر فرش پر اترا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا بالکنی کے کٹہرے کی سلاخوں

میں سے نکل کر چھجے پر کود گیا۔ میں حیران وہیں کھڑا رہا اور سوچنے لگا یہ کیسا حیوان ہے جس پر مار کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا سعادت۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں بڑا خوفناک بلا ہے۔ یہ موٹا سر۔ رنگ سفید ہے۔ لیکن اکثر میلا رہتا ہے۔ میں نے ایسا غلیظ بلا اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔"

زیدی نے ایش ٹرے میں سگرٹ بجھایا اور خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا: "بلّے بلیاں تو خود کو بہت صاف ستھرا رکھتے ہیں۔"

"رکھتے ہیں۔" زیدی اٹھ کھڑا ہوا! "لیکن یہ بلا شاید جان بوجھ کر خود کو غلیظ رکھتا ہے۔ لیٹتا ہے کوڑے کرکٹ کے پاس۔ کان سے لہو بہہ رہا ہے پر مجال ہے اسے چاٹ کر صاف کرلے ــــــ سر بھٹا ہوا ہے۔ پر اسے کچھ ہوش نہیں۔ بس سارا دن مارا مارا پھرتا ہے۔"

میں نے پوچھا: "لیکن اس میں خوف کھانے کی کیا بات ہے۔"

زیدی بیٹھ گیا: "یہی تو میں خود دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ ڈر کی یوں تو ایک وجہ ہو بھی سکتی ہے وہ یہ کہ دس پندرہ راتیں متواتر وہ مجھے جگاتا رہا۔ مجھ سے ہر دفعہ اس نے مار کھائی۔ بہت بری طرح پٹا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ میرے گھر کا رخ نہ کرتا۔ کیونکہ آخر حیوان میں بھی عقل ہوتی ہے۔ میں سوچنے لگا۔ کسی روز ایسا نہ ہو مجھ پر جھپٹ پڑے اور آنکھ وانکھ نوچ لے۔ سننے میں آیا ہے کہ اگر کسی بلّے یا بلی کو گھیر کر مارا جائے تو وہ ضرور حملہ کرتے ہیں۔"

"میں نے کہا: "ڈرنے کی یہ وجہ تو معقول ہے۔"

زیدی پھر اٹھ کھڑا ہوا: "لیکن اس سے میری تسکین نہیں ہوتی۔" میرے دماغ میں ایک خیال آیا: "تم اس کے ساتھ محبت پیار سے تو

پیش آکر دیکھو۔"

"میں ایسا کر چکا ہوں ——— میرا خیال تھا۔ اس قدر پٹنے پر وہ مجھے ہاتھ بھی نہ لگانے دے گا۔ لیکن معاملہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔ برعکس بھی نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ اس نے میرے پیار کی بالکل پرواہ نہ کی۔ ایک روز صوفے پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ پاس آکر فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ یہ بڑھا ہوا ہاتھ میں نے اس کی پیٹھ پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا ——— سعادت تم یقین کرو۔ وہ ویسے کا ویسا آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔ پیار کا جواب بلیاں اکثر دم ہلا کر دیتی ہیں۔ لیکن اس کم بخت کی دم کا ایک بال بھی نہ ہلا۔ میں نے تنگ آکر اس کے سر پر کتاب ماری۔ چوٹ کھا کر وہ اٹھا۔ بڑی بے پروائی۔ ایک نہایت ہی دل شکن بے اعتنائی سے میری طرف پیلی پیلی آنکھوں سے دیکھا اور بالکنی کے کٹہرے کی سلاخوں میں سے نکل کر نیچے کود گیا۔ بس اسی دن سے چوبیس گھنٹے وہ میرے دماغ میں رہنے لگا ہے۔" یہ کہکر زیدی میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور زور زور سے اپنی ٹانگ ہلانے لگا۔

میں نے صرف اتنا کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آتا تھا کہ زیدی کا خوف بے بنیاد نہیں۔

زیدی دانتوں سے ناخن کاٹنے لگا "میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے پاس آیا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد رکا اور ایش ٹرے میں سے بجھی ہوئی دیا سلائی اٹھا کر اس کے ٹکڑے کرنے لگا "اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ رات بھر جاگتا

رہتا ہوں۔ ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو سمجھتا ہوں وہی بلا ہے۔ لیکن آٹھ روز سے وہ کہیں غائب ہے۔ معلوم نہیں کسی نے مار ڈالا ہے۔ بیمار ہے یا کہیں اور چلا گیا ہے۔"

میں نے کہا "تم کیوں سوچتے ہو۔ اچھا ہے جو غائب ہو گیا ہے۔"

"معلوم نہیں کیوں سوچتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ اس کم بخت کو بھول جاؤں مگر دماغ میں سے نکلتا ہی نہیں" یہ کہہ کر وہ صوفے پر سر کے نیچے گدی رکھ کر لیٹ گیا۔ "عجیب ہی قصہ ہے کوئی اور سنے تو ہنسے کہ ایک بلے نے میری یہ حالت کر دی ہے۔ بعض اوقات مجھے خود ہنسی آتی ہے۔ لیکن یہ ہنسی کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔"

زیدی نے یہ کہا اور مجھے احساس ہوا کہ واقعی اپنی بے لبی پر ہنستے ہوئے اسے بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ جو کچھ اس نے بیان کیا تھا۔ بظاہر مضحکہ خیز تھا۔ لیکن یہ بالکل واضح تھا کہ اس بلے کے وجود میں زیدی کی زندگی کا کوئی بہت ہی اذیت دہ لمحہ پوشیدہ تھا۔

ایسا لمحہ جو اُسے اب بالکل یاد نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا "زیدی تمہارے ماضی میں کوئی ایسا حادثہ تو نہیں جس سے تم اس بلے کو متعلق کر سکو۔ میرا مطلب ہے کوئی ایسی چیز۔ کوئی ایسا واقعہ جس سے تم نے خوف کھایا ہو اور اُس چیز یا واقعے کی شباہت اس بلے سے ملتی ہو۔"

یہ کہہ کر میں نے سوچا کہ واقعے کی شباہت بلے سے کیسے مل سکتی ہے۔

زیدی نے جواب دیا "میں اس پر بھی غور کر چکا ہوں۔ میرے حافظے میں ایسا کوئی واقعہ یا ایسی کوئی چیز نہیں۔"

میں نے کہا "ممکن ہے کبھی یاد آ جائے"

"ایسا ہو سکتا ہے " یہ کہہ کر زیدی صوفے پر سے اُٹھا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور مجھے اور میری بیوی کو اتوار کی دعوت دیکر چلا گیا۔

اتوار کو میں اور میری بیوی سنتا کروز گئے۔ میں نے شاید آپ کو پہلے نہیں بتایا۔ زیدی میرا بہت پُرانا دوست ہے۔ انٹرنس تک ہم دونوں ایک ہی اسکول میں تھے۔ کالج میں بھی ہم دو برس ایک ساتھ رہے میں فیل ہو گیا اور وہ ایف اے پاس کرکے امرتسر چھوڑ کر لاہور چلا گیا جہاں اس نے ایم۔ اے کیا اور چار پانچ برس بیکار رہنے کے بعد بمبئی چلا آیا۔ یہاں وہ ایک برس سے جہازوں کی ایک کمپنی میں ملازم تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ...... ہم دیر تک نئے اور پُرانے فلموں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ زیدی کی بیوی اور میری بیوی دونوں "بہت فلم دیکھو" قسم کی عورتیں ہیں۔ چنانچہ اس گفتگو میں زیادہ حصّہ انہی کا تھا۔ دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے ہی والی تھیں کہ بالکنی کے کٹہرے کی سلاخوں سے ایک موٹا بلّا اندر داخل ہوا۔ میں نے اور زیدی نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔ زیدی کے چہرے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ وہی بلّا ہے۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ سر پر کانوں کے پاس ایک گہرا زخم تھا جس پر ہلدی لگی ہوئی تھی۔ بال بے حد میلے تھے۔ چال میں جیسا کہ زیدی نے کہا تھا ایک عجیب قسم کی بے پرواہی تھی۔ ہم چار آدمی کمرے میں موجود تھے مگر اس نے کسی کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ جب میری بیوی کے پاس سے گذرا تو وہ چیخ اٹھی " یہ کیسا بلّا ہے سعادت صاحب "۔

" میں نے پوچھا " کیا مطلب ؟ "

میری بیوی نے جواب دیا " پورا بدمعاش لگتا ہے "

زیدی نے بوکھلا کر کہا "بدمعاش"

میری بیوی شرما گئی "جی ہاں ایسا ہی لگتا ہے"

زیدی کچھ سوچنے لگا۔ دونوں عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں

تھوڑی دیر کے بعد زیدی اٹھا "سعادت ذرا ادھر آؤ"

مجھے بالکنی میں لے جا کر اس نے کہا "معمّہ حل ہو گیا ہے"

"کیسے؟"

"تمہاری بیوی نے حل کر دیا ——— تم بھی سوچو کیا اس بلّے کی شکل مس ٹین والا سے نہیں ملتی"

"مس ٹین والے سے"

"ہاں ہاں — اس بدمعاش سے جو ہمارے اسکول کے باہر بیٹھا رہتا تھا۔ مصطفےٰ جیسے مس ٹین والا کہا کرتے تھے۔"

مجھے یاد آ گیا — زیدی پر جو لڑکپن میں بہت خوبصورت تھا مس ٹین والے کی خاص نظر تھی۔ لیکن میں سوچنے لگا بلّے سے اس کی شکل کیسے ملتی ہے۔ نہیں نہیں ملتی تھی۔ اس کی چال میں بھی کچھ ایسی ہی بے پروائی تھی۔ سر اکثر پھٹا رہتا تھا۔ کئی مرتبہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے لڑکوں سے پٹوایا کہ وہ اسکول کے دروازے کے پاس نہ کھڑا رہا کرے۔ مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ایک لڑکے کے باپ نے اسے ہاکی سے اتنا مارا، اتنا مارا کہ لوگوں کا خیال تھا ہسپتال میں مر جائے گا۔ مگر دوسرے ہی روز وہ پھر اسکول کے گیٹ کے باہر موجود تھا۔

یہ سب باتیں ایک لمحے کے اندر اندر میرے دماغ میں ابھریں

میں نے زیدی سے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو مس ٹین والا بھی مار کھا کر خاموش

رہا کرتا تھا۔

زیدی نے جواب نہ دیا اس لئے کہ وہ کچھ یاد کر رہا تھا۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا، "میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ پڑھنے کے لئے ایک دفعہ اکیلا کمپنی باغ چلا گیا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اچانک ٹس ٹین والا نمودار ہوا۔ ہاتھ میں ایک خط تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "بابوجی یہ خط پڑھ دیجئے"۔ ——— میری جان ہوا ہو گئی۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ ٹس ٹین والے نے خط میری ران پر پھینک دیا۔ میں اٹھ بھاگا۔ اس نے میرا پیچھا کیا۔ لیکن میں اس قدر تیز دوڑا کہ وہ بہت پیچھے رہ گیا۔ گھر پہنچتے ہی مجھے تیز بخار چڑھا۔ دو دن تک ہذیانی کیفیت رہی۔ میری والدہ کا خیال تھا کہ جس درخت کے نیچے پڑھنے کے لئے بیٹھا تھا آسیب زدہ تھا۔"

زیدی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ بلا ہماری ٹانگوں میں سے گذر کر کٹہرے کی سلاخوں میں سے نکلا اور پیچھے پر کود گیا۔ چھجے پر چند قدم چل کر اس نے مڑ کر پیلی پیلی آنکھوں سے ہماری طرف اپنی مخصوص بے پروائی سے دیکھا۔ میں نے مسکرا کر کہا، "ٹس ٹین والا"۔ زیدی جھینپ گیا۔

~ ۞ ~
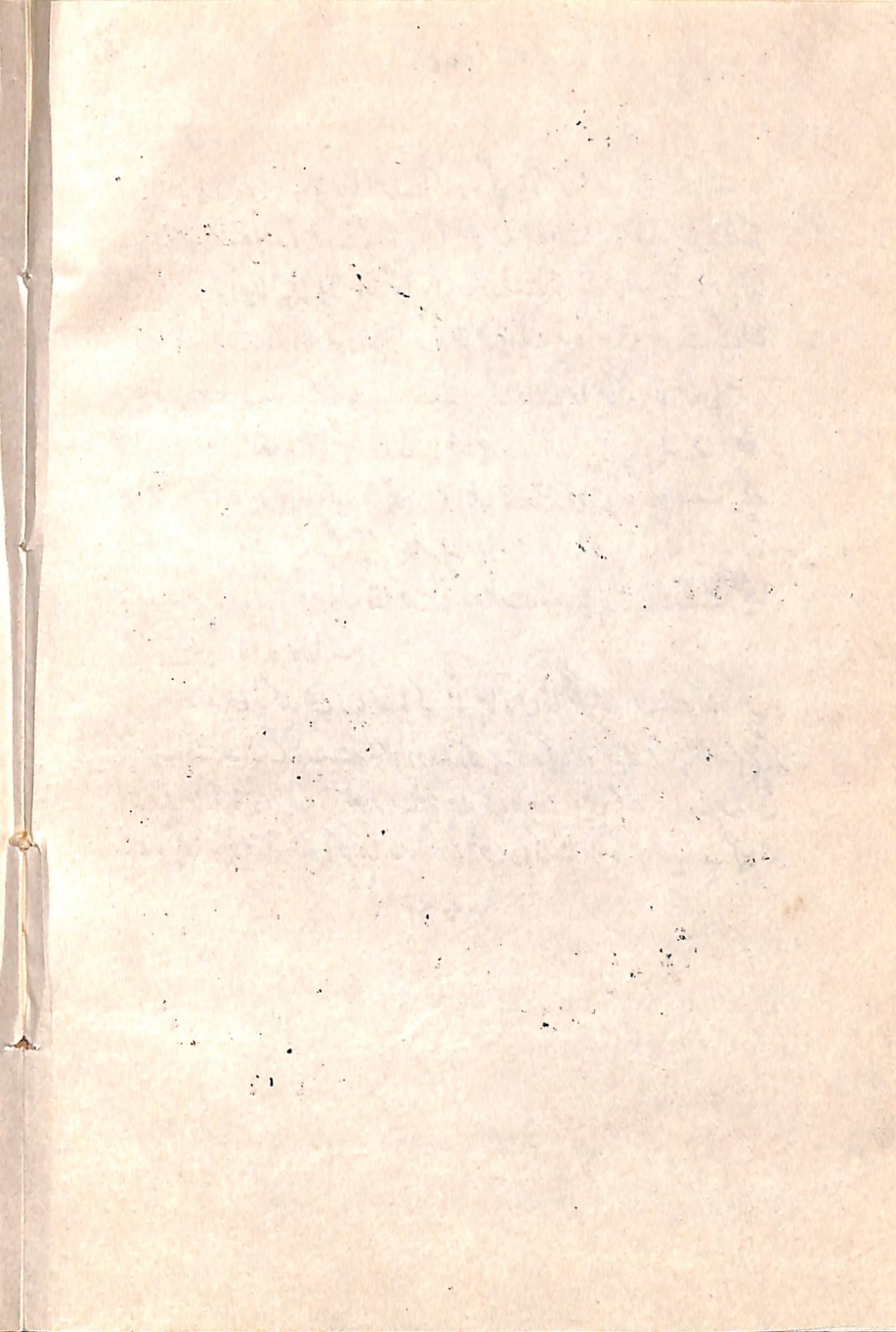
بابو گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈر لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآوازِ بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔ "منٹو صاحب۔ بابو گوپی ناتھ سے ملئے۔"

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسبِ عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ "بابو گوپی ناتھ! تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے، لوگوں کی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے

"پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلہ لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب۔ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ جوا ساز گار ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ۔ ہے نہ اینٹی کی پینٹی پو ؟"

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا کنٹی نیوٹلی۔ دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو۔ ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا۔ جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ "آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے"

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا "نمبر ون بیوقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کرکے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں بس منٹو صاحب۔ یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے انٹی فلو جسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے"

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا "ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب۔ پھر سینڈو سے پوچھا "کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں ۔"

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا "اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آئیے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے اس لئے کہ مفت ملتی ہے"

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ لکھا دیا۔ جہاں میں حسبِ وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں۔ تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا "آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے آپ۔ ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو۔ یا جس کے منہ سے لعاب نکلتا ہو۔ پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں۔ کیونکہ انھیں وہاں کوئی اور بے وقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگرٹ اور سکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو۔"

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان کسرتی بدن۔ منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا "یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی۔ بڑی بڑی کنٹی نینٹلیاں ملائی گئیں۔ اس کو پھانسنے کے لیے مگر اس نے کہا ڈو اور ڈائی میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ ایک تکیئے میں بات چیت پیتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہو گئی۔

بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز گرلیون اے کاڈ بہ الجبر
کھانا پینا مقرر ہے۔"

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کشمیر کی کبوتری ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الھڑ اور ناتجربہ کار ہے
سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔" زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولس عیش کرتی رہی آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے ——
دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی۔ جو خاموش بیٹھی سگرٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور سینڈو سے کہا۔" اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔"

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا۔" جناب یہ ہے ٹین پٹوٹی۔ فل فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم —— آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں

ہیرا دھرن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے۔ تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ گریون اے کارا شن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے رنگ کالا ہے مگر ویسے بڑی ٹیٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے۔"

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا۔ "بکواس نہ کر۔" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسبِ عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا۔ "چھوڑو یار۔ آؤ باتیں کریں۔" سینڈو چلایا۔ "بوائے۔ وسکی اینڈ سوڈا ——— بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سبزے کو۔"

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندا نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا۔ "او گوڈ ——— او میرے رب العالمین ——— وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا ——— جاؤ بھئی غلام علی۔ دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔"

بوتلیں آئیں، تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسبِ معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا۔ "دھڑن تختہ منٹو صاحب وسکی ہو تو ایسی ——— حلق سے اتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے۔ جیو بابو گوپی ناتھ جیو ———"

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں

ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے مان لیتا ہے۔ ضیعف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دورانِ گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا۔

"بابو گوپی ناتھ! کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

وہ چونک پڑا۔ "جی میں ـــــ میں ـــــ کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔ "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں ـــــ اور ہمیں کیا سوچ ہوگی۔"

سینڈو نے کہا۔ "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں ـــــ لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی ٹیوٹلی نہ رہ چکی ہو۔"

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا۔ "اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب!"

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہوگئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی؟ کون نٹنی تھی؟ کون کس کی نوچی تھی؟ نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار سینڈو۔ غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی۔ ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا۔ مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اُسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی پیا۔ بغیر کسی دلچسپی کے۔ سگرٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا اُسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگرٹ اسی نے پئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اُسے محبت تھی؟ اس کا پتا مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لئے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اُسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پیگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا۔ "منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ "بڑا نیک خیال ہے۔"

بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا۔ "منٹو صاحب ہے بھی بڑی نیک لڑکی۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا۔ جانِ من مکان بنوا دوں؟ جواب کیا دیا معلوم ہے آپ کو؟۔ کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا

کون ہے ـــــ منٹو صاحب موٹر کتنے میں آ جائے گی۔"

میں نے کہا: "مجھے معلوم نہیں!"

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا: "کیا بات کرتے ہیں آپ منٹو صاحب۔ ـــــ آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ۔ زینو کے لئے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہیئے۔"

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا: "منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں ـــــ لیکن آپ مجھے بتائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا: مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجیئے گا" ـــــ بہت گنہگار آدمی ہوں ـــــ وسکی منگاؤں آپ کے لئے اور۔"

میں نے کہا: "نہیں نہیں ـــــ بہت پی چکے ہیں۔"

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا۔ "اور پیجئے منٹو صاحب۔" یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندا نکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔

"سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا۔؟"

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا: "منٹو صاحب

اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑے گا یا ـــــ"

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرامزادے نے اس کی جیب میں سے سارے روپے نکال لئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا۔ "جلدی کھانا لے آؤ۔"

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا۔ لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پہلے درجے کا چغد ہے۔ غلط ثابت ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں، گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا: "منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انہیں عقلمند سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جس سے ان کا اُلّو سیدھا ہو سکتا ہے۔" بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بس یہ دو جگہیں ہیں

جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔"

میں نے اس سے پوچھا "رنڈی کے کوٹھے اور تکئے آپ کو کیوں پسند ہیں؟"

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا "اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اُس کے لئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے ایک اور سوال کیا "آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا "بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سُری سے کن سُری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں — منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لئے ایک ادا سے اُٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اُڑس لیا۔ اس نے جھک کر اُسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔"

بابو گوپی ناتھ کا شجرۂ نسب تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اُسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اُڑانا شروع کر دی۔

بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب
چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے
تھے۔

زینو کے لئے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا۔ لیکن شاید
تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔
بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی
تھی لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت
میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو
دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری
مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گائکی
کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک
حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں
کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے
اُس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی
بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی اس لئے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں
کے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی
بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے)
کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ عمدہ
سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کبھی

طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں۔ اس کی بذلہ سنج طبیعت میں جس میں میراثیوں کے مزاج کی جھلک تھی، بہت ہی جاذب نظر تھی۔ وہ کوشش کئے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اُسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لئے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا۔ مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اُسے لایا تھا۔ ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا۔ وہ سگرٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا۔ جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا "او بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گذر بھی اس وادی میں ہوتا ہے۔؟"

سینڈو نے کہا "تشریف لے آیئے عزرائیل صاحب یہاں ویلکم ٹو تھنڈ"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی۔ لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سادہ لوح۔ صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا، اس کے علاوہ ـــــ کچھ یوں کہیئے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا جس سے فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا۔ لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "آیئے منٹو صاحب"، کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "منٹو صاحب! مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانیؒ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گزارہ کیا

میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو۔ جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہی ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی۔ تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ اسے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹریس بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گر سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو ——— منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی ——— آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے۔ سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی

مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ اُس کے متعلق؟"
میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا لیکن بابو گوپی ناتھ
نے خود ہی کہا: "اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے —
کیوں زینو جانی ——— پسند ہے نہیں؟"
زینو خاموش رہی۔
بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم
ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن بعد
میں مشاہدے نے میری حیرت دُور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت
بمبئی میں کسی اچھے مال دار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے
جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہوسکے۔
زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہو تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز
نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی
نیت نیک تھی اس لئے اس نے زینت کے مستقبل کے لئے ہر ممکن کوشش کی
اُس کو ایکٹریس بنانے کے لئے اُس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔
گھر میں ٹیلی فون لگوا دیا۔ لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔
محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے
زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا
بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا: "شفیق
صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھئے۔ لیکن بے چاری زینت
سے جاتے ہوئے چھ تکیئے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے
آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔"

(ج)

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھالیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا اُسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اُسے تلاش کیا لیکن کسی کو اس کا پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا "مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے ——— ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکل سے کئی گیلن پیٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات امید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گزر گیا لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہارنبی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یٰسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

لیسین مسکرایا " تم جانتے ہو موٹر والی کو "

میں نے کہا " جانتا ہوں "

" تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ——— اچھی لڑکی ہے یار " لیسین نے مجھے آنکھ ماری - میں مسکرا دیا -

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا - اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے لیسین کی ملاقات کیسے ہوئی - ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں - وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑا کر چلا گیا - لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی -

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں لیسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گزر جائیں زینت اور لیسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے ——— مگر ایسا نہ ہوا -

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا - اس کی جوان لڑکی میوریل سے لیسین کی آنکھ لڑ گئی چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور لیسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا -

بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت دکھ ہوا - اس نے مجھ سے کہا " منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو - لیکن زینت بھی عجیب ہے - اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے - مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی - میاں اگر تم نے اس کرسٹان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو - میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو ———

میں کیا کروں منٹو صاحب! ؟ بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ــــ
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ــــ تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیئے "
یٰسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔
بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلیفون
کیا تو معلوم ہوا۔ بابو گوپی ناتھ۔ غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا
گیا ہے۔ روپے کا بندوبست کرنے۔ کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔
جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن
لگیں گے کیونکہ اسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔
سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن مکھن
کی۔ چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس
کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا اس لئے
اسے اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے
زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔
میں نے ایک دن زینت سے کہا " یہ تم کیا کر رہی ہو "
اس نے بڑے الھڑپن سے کہا " مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔
یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں "
جی چاہا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر اسے سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک
نہیں۔ سینڈو اور سردار اپنا الّو سیدھا کرنے کے لئے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے
مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ۔ بے امنگ
اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت
بھی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔

واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگرٹ سے، شراب سے۔ کھانے سے۔ گھر سے، ٹیلی فون سے رہتی کہ اس صوفے سے کبھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ماہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کی دس ہزار روپے اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔

قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا۔ "سینڈو۔"

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اس قدر نکلا۔ "دھڑن تختہ!"

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو۔ لیکن سینڈو نے کہا ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجئے۔ مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔"

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دور لے گیا۔ دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا "واپس چلو۔"

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا "منٹو صاحب زینو کی شادی ہونے والی ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "کس سے؟"

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا "حیدرآباد سندھ کا ایک دولتمند زمیندار ہے۔ خدا کرے دونوں خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں عین وقت پر آپہنچا جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائے گا ——— کیوں کیا خیال ہے آپ کا۔"

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدرآباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے؟ سینڈو اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً حیدرآباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدرآباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدرآباد سندھ کے رئیس کا نام تھا)۔ کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر و مدارات کی۔ غلام حسین کی پرزور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل "نکتہ چیں ہے غم دل اُس کو سنائے نہ بنے ——— گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دونی ہو گئی۔ مجھ سے اس نے کہا: "منٹو صاحب خوبصورت جوان اور بڑا لائق آدمی ہے ــــــ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی ــــــ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے اور پانچ ہزار نقد دیئے۔

محمد شفیق طوسی، محمد یٰسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل، سینڈو، میوزک ٹیچر میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دولہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا: "دھڑن تختہ!"

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارک باد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلہ میں چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لئے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں کہا: "منٹو صاحب ذرا اندر جایئے اور دیکھئے زینو دولہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔"

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زر لفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی ــــــ دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی ہے۔ مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا "یہ کیا مسخرہ پن ہے"

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی دیکھا "آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان" اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا "منٹو صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھ دار اور لائق آدمی ہیں ــــــ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا"

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا "خدا تمہیں خوش رکھے"

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی ــــــ بہت ہی دکھ بھری ملامت ــــــ اور چلا گیا۔

〰 ⁂ 〰

میرا نام رادھا ہے

یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب اس جنگ کا نام و نشان بھی نہیں تھا
غالباً آٹھ نو برس پہلے کی بات ہے جب زندگی میں ہنگامے بڑے سلیقے سے آتے تھے
آج کل کی طرح نہیں کہ بے ہنگم طریقے پر پے در پے حادثے برپا ہو رہے ہیں کسی
ٹھوس وجہ کے بغیر۔

اس وقت میں چالیس روپے ماہوار پر ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا اور
میری زندگی بڑے ہموار طریقے پر افتاں و خیزاں گزر رہی تھی۔ یعنی صبح
دس بجے اسٹوڈیو گئے۔ نیاز محمد ولن کی بلیوں کو دو پیسے کا دودھ پلایا۔ چالو
فلم کے لئے چالو قسم کے مکالمے لکھے۔ بنگالی ایکٹرس سے جو اس زمانے میں
بلبلِ بنگال کہلاتی تھی تھوڑی دیر مذاق کیا اور دادا گورے کی جو اس عہد کا
سب سے بڑا فلم ڈائرکٹر تھا تھوڑی سی خوشامد کی اور گھر چلے آئے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ زندگی بڑے ہموار طریقے پر افتاں و خیزاں گذر رہی تھی۔ اسٹوڈیو کا مالک ہرمزجی فرام جی جو موٹے موٹے لال گالوں والا موجی قسم کا ایرانی تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی خوجہ ایکٹریس کی محبت میں گرفتار تھا۔ ہر نووارد لڑکی کے پستان ٹٹول کر دیکھنا اس کا شغل تھا۔ کلکتہ کے بوبازار کی ایک مسلمان رنڈی تھی جو اپنے ڈائرکٹر، ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور اسٹوری رائٹر تینوں سے بیک وقت عشق لڑا رہی تھی۔ اس عشق کا دراصل مطلب یہ تھا کہ ان تینوں کا التفات اس کے لئے خاص طور پر محفوظ رہے۔

"بن کی سندری" کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ نیاز محمد ولن کی جنگلی بلیوں کو جو اس نے خدا معلوم اسٹوڈیو کے لوگوں پر کیا اثر پیدا کرنے کے لئے پال رکھی تھیں دو پیسے کا دودھ پلا کر میں ہر روز اس "بن کی سندری" کے لئے ایک غیر مانوس زبان میں مکالمے لکھا کرتا تھا۔ اس فلم کی کہانی کیا تھی پلاٹ کیسا تھا۔ اس کا علم جیسا کہ ظاہر ہے مجھے بالکل نہیں تھا۔ کیونکہ میں اس زمانے میں ایک منشی تھا۔ جس کا کام صرف حکم ملنے پر جو کچھ کہا جائے غلط سلط اردو میں جو ڈائرکٹر صاحب کی سمجھ میں آجائے پنسل سے ایک کاغذ پہ لکھ کر دینا ہوتا تھا۔ خیر "بن کی سندری" کی شوٹنگ چل رہی تھی اور یہ افواہ گرم تھی کہ "ویمپ" کا پارٹ ادا کرنے کے لئے ایک نیا چہرہ سیٹھ ہرمزجی فرام جی کہیں سے لا رہے ہیں۔ ہیرو کا پارٹ راج کشور کو دیا گیا تھا۔

راج کشور راولپنڈی کا ایک خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس کے جسم کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ بہت مردانہ اور سڈول ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اس کے متعلق غور کیا مگر مجھے اس کے جسم میں جو کہ یقیناً کسرتی اور متناسب تھا کوئی کشش نظر نہ آئی مگر اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں

بہت ہی دبلا اور مریل قسم کا انسان ہوں اور اپنے ہم جنسوں کے جسم کے متعلق اتنا زیادہ غور کرنے کا عادی نہیں جتنا ان کے دل و دماغ اور روح کے متعلق سوچنے کا عادی ہوں۔

مجھے راج کشور سے نفرت نہیں تھی۔ اس لئے کہ میں نے اپنی عمر میں شاذ و نادر ہی کسی انسان سے نفرت کی ہے۔ مگر وہ مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں تھا۔ اس کی وجہ میں آہستہ آہستہ آپ سے بیان کروں گا۔

راج کشور کی زبان۔ اس کا لب و لہجہ جو ٹھیٹ راولپنڈی کا تھا مجھے بے حد پسند تھا۔ میرا خیال ہے کہ پنجابی زبان میں اگر کہیں خوبصورت قسم کی شیرینی ملتی ہے تو وہ راولپنڈی کی زبان ہی میں آپ کو مل سکتی ہے۔ اس شہر کی زبان میں ایک عجیب قسم کی مردانہ نسائیت ہے جس میں بیک وقت مٹھاس اور گھلاوٹ ہے۔ اگر راولپنڈی کی کوئی عورت آپ سے بات کرے تو ایسا لگتا ہے کہ لذیذ آم کا رس آپ کے منہ میں چوایا جا رہا ہے ــــــ مگر میں آموں کی نہیں راج کشور کی بات کر رہا تھا جو مجھے آم سے بہت کم عزیز تھا۔

راج کشور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ یہاں تک بات ختم ہو جاتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر مصیبت یہ ہے کہ اُسے یعنی راج کشور کو خود اپنی صحت اور اپنے خوش شکل ہونے کا احساس تھا۔ ایسا احساس جو کم از کم میرے لئے ناقابلِ قبول تھا۔

صحت مند ہونا بڑی اچھی چیز ہے۔ مگر دوسروں پر اپنی صحت کو بیماری بنا کر عائد کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ راج کشور کو یہی مرض لاحق تھا کہ وہ اپنی صحت، اپنی تندرستی، اپنے متناسب اور سڈول اعضاء کی غیر ضروری نمائش کے ذریعے سے ہمیشہ دوسرے لوگوں کو جو اس سے کم صحت مند تھے مرعوب کرنے

کی کوشش میں مصروف رہتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں دائمی مریض ہوں، کمزور ہوں۔ میرے ایک پھیپھڑے میں ہوا کھینچنے کی طاقت بہت کم ہے مگر خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے آج تک اس کمزوری کا کبھی پروپیگنڈا نہیں کیا۔ حالانکہ مجھے اس کا پوری طرح علم ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں سے اسی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے جس طرح کہ اپنی طاقتوں سے اٹھاتا ہے۔ مگر میرا ایمان ہے کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

خوب صورتی میرے نزدیک وہ خوبصورتی ہے جس کی دوسرے بلند آواز میں نہیں بلکہ دل ہی دل میں تعریف کریں۔

میں اس صحت کو بیماری سمجھتا ہوں جو ننگا ہو کے ساتھ پتھر بن کر ٹکراتی رہے۔

راج کشور میں وہ تمام خوبصورتیاں موجود تھیں۔ جو ایک نوجوان مرد میں ہونی چاہئیں۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ اُسے ان خوبصورتیوں کا نہایت ہی بھونڈا مظاہرہ کرنے کی عادت تھی۔ آپ سے بات کر رہا ہے اور اپنے ایک بازو کے پٹھے اکڑا رہا ہے اور خود ہی داد دے رہا ہے۔ نہایت ہی اہم گفتگو ہو رہی ہے۔ یعنی سوراج کا مسئلہ چھڑا ہے اور وہ اپنے کھادی کے کُرتے کے بٹن کھول کر اپنے سینے کی چوڑائی کا اندازہ کر رہا ہے۔

میں نے کھادی کے کُرتے کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ راج کشور پکا کانگرسی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسی وجہ سے کھادی کے کپڑے پہنتا ہو مگر میرے دل میں ہمیشہ اس بات کی کھٹک رہی ہے کہ اُسے اپنے وطن سے اتنا پیار نہیں تھا جتنا کہ اُسے اپنی ذات سے تھا۔

بہت لوگوں کا خیال تھا کہ راج کشور سے متعلق جو میں نے رائے قائم کی ہے سراسر غلط ہے۔ اس لئے کہ اسٹوڈیو اور اسٹوڈیو کے باہر ہر شخص اس کا مداح تھا۔ اس کے جسم کا، اس کے خیالات کا۔ اس کی سادگی کا۔ اس کی زبان کا جو خاص راولپنڈی کی تھی۔ اور مجھے بھی پسند تھی۔

دوسرے ایکٹروں کی طرح وہ الگ تھلگ رہنے کا عادی نہیں تھا۔ کانگریس پارٹی کا کوئی جلسہ ہو تو راج کشور کو آپ وہاں ضرور موجود پائیں گے۔ کوئی ادبی میٹنگ ہو رہی ہے تو راج کشور ضرور پہنچے گا۔ اپنی مصروف زندگی میں سے وہ اپنے ہمسایوں اور معمولی جان پہچان کے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لئے بھی وقت نکال لیا کرتا تھا۔

سب فلم پروڈیوسر اس کی عزت کرتے تھے کیونکہ اس کے کیریکٹر کی پاکیزگی کا بہت شہرہ تھا۔ فلم پروڈیوسروں کو چھوڑیئے پبلک کو بھی اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ راج کشور ایک بہت بلند کردار کا مالک ہے۔

فلمی دنیا میں رہ کر کسی شخص کا گناہ کے دھبوں سے پاک رہنا بہت بڑی بات ہے۔ یوں تو راج کشور ایک کامیاب ہیرو تھا۔ مگر اس کی خوبی نے اُسے ایک بہت ہی اُونچے رتبے پر پہنچا دیا تھا۔

ناگپاڑے میں جب میں شام کو پان والے کی دکان پر بیٹھتا تھا تو اکثر ایکٹر ایکٹرلیسوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ قریب قریب ہر ایکٹر اور ایکٹرلیس کے متعلق کوئی نہ کوئی اسکینڈل مشہور تھا۔ مگر راج کشور کا جب بھی ذکر آتا۔ شام لال پنواڑی بڑے فخریہ لہجے میں کہا کرتا "منٹو صاحب راج بھائی ہی ایسا ایکٹر ہے جو لنگوٹ کا بڑا پکا ہے"۔

معلوم نہیں شام لال اسے راج بھائی کیسے کہنے لگا تھا مگر اس کے

متعلق مجھے اتنی زیادہ حیرت بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ راج بھائی کی معمولی سے معمولی بات بھی ایک کارنامہ بن کر لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔

مثلاً باہر کے لوگوں کو اس کی آمدن کا پورا حساب معلوم تھا۔ اپنے والد کو ماہوار خرچ کیا دیتا ہے۔ یتیم خانوں کے لیے کتنا چندہ دیتا ہے اس کا اپنا جیب خرچ کیا ہے۔ یہ سب باتیں لوگوں کو اس طرح معلوم تھیں جیسے انہیں ازبر یاد کرائی گئی ہیں۔

شام لال نے ایک روز مجھے بتایا کہ راج بھائی کا اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک ہے اُس زمانے میں جب آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ باپ اور اُس کی نئی بیوی اُسے طرح طرح سے دکھ دیتے تھے۔ مگر مرحبا ہے۔ راج بھائی کا کہ اس نے اپنا فرض پورا کیا اور ان کو اپنے سر آنکھوں پر جگہ دی اب دونوں چھپر کھٹوں پر بیٹھے راج کرتے ہیں۔ ہر روز صبح سویرے راج اپنی سوتیلی ماں کے پاس جاتا ہے اور اس کے چرن چھوتا ہے۔ باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو جاتا ہے اور جو حکم ملے فوراً بجا لاتا ہے۔

آپ برا نہ مانیے گا مگر مجھے راج کشور کی تعریف و توصیف سن کر ہمیشہ الجھن سی ہوتی تھی۔ خدا جانے کیوں؟ —— میں جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں۔ مجھے اس سے حاشا وکلا نفرت نہیں تھی۔ اس نے مجھے کبھی ایسا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اور پھر اس زمانے میں جب منشیوں کی کوئی عزت و وقعت ہی نہیں تھی وہ میرے ساتھ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کیا وجہ تھی۔ لیکن ایمان کی بات ہے کہ میرے دل و دماغ کے کسی اندھیرے کونے میں یہ شک بجلی کی طرح کوندجاتا کہ راج بن رہا ہے۔ راج کی زندگی بالکل مصنوعی ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ میرا کوئی ہم خیال نہیں تھا۔ لوگ

دیوتاؤں کی طرح اس کی پوجا کرتے تھے۔ اور میں دل ہی دل میں کڑھتا تھا
راج کی بیوی تھی راج کے چار بچے تھے۔ وہ اچھا خاوند اور اچھا باپ
تھا۔ اس کی زندگی پر سے چادر کا کوئی کونہ بھی اگر ہٹا کر دیکھا جاتا تو آپ کو
کوئی تاریک چیز نظر نہ آتی۔ یہ سب کچھ تھا مگر اس کے ہوتے ہوئے بھی میرے
دل میں شک کی گدگدی ہوتی ہی رہتی تھی۔

خدا کی قسم میں نے کئی دفعہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کی کہ کیوں تم
بڑے ہی واہیات ہو کہ ایسے اچھے انسان کو جسے ساری دنیا اچھا کہتی
ہے اور جس کے متعلق تمہیں کوئی شکایت بھی نہیں کیوں بے کار شک کی نظروں
سے دیکھتے ہو۔ اگر ایک آدمی اپنا سڈول بدن بار بار دیکھتا ہے تو یہ کون
سی بڑی بات ہے۔ تمہارا بدن بھی اگر ایسا ہی خوبصورت ہوتا تو بہت
ممکن ہے تم بھی یہی حرکت کرتے۔

سب کچھ ٹھیک ہے مگر میں اپنے دل و دماغ کو کبھی آمادہ نہ کر سکا کہ وہ راج کشور
کو اسی نظر سے دیکھے جس سے دوسرے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں دوران
گفتگو میں اکثر اس سے الجھ جایا کرتا تھا۔ میرے مزاج کے خلاف کوئی بات
کی اور میں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ لیکن ایسی چپقلشوں کے بعد ہمیشہ
اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور میرے حلق میں ایک ناقابلِ بیان تلخی رہی۔
مجھے اس سے اور بھی زیادہ الجھن ہوتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی زندگی میں کوئی اسکینڈل نہیں تھا۔
اپنی بیوی کے سوا کسی دوسری عورت کا میلا یا اجلا دامن اس سے وابستہ
نہیں تھا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وہ سب ایکٹریسوں کو بہن کہہ کر
پکارتا تھا۔ اور وہ بھی اسے جواب میں بھائی کہتی تھیں مگر میرے دل نے

ہمیشہ میرے دماغ سے یہی سوال کیا کہ یہ رشتہ قائم کرنے کی ایسی اشد ضرورت ہی کیا ہے۔

بہن، بھائی کا رشتہ کچھ اور ہے مگر کسی عورت کو اپنی بہن کہنا اس انداز سے جیسے یہ بورڈ لگایا جا رہا ہے کہ سڑک بند ہے یا "یہاں پیشاب کرنا منع ہے" بالکل دوسری بات ہے۔

اگر تم کسی عورت سے جنسی رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتے تو اس کا اعلان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر تمہارے دل میں تمہاری بیوی کے سوا اور کسی عورت کا خیال داخل نہیں ہو سکتا تو اس کا اشتہار دینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی اور اسی قسم کی دوسری باتیں چونکہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اس لئے مجھے عجیب قسم کی الجھن ہوتی تھی۔

خیر!

"بن کی سندری" کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ اسٹوڈیو میں خاصی چہل پہل تھی۔ ہر روز اکسٹرا لڑکیاں آتی تھیں جن کے ساتھ ہمارا دن ہنسی مذاق میں گذر جاتا تھا۔

ایک روز نیاز محمد ولن کے کمرے میں میک اپ ماسٹر جسے ہم استاد کہتے تھے یہ خبر لے کر آیا کہ ویمپ کے رول کے لئے جو نئی لڑکی آنے والی تھی آ گئی ہے اور بہت جلد اس کا کام شروع ہو جائے گا۔

اس وقت چائے کا دور چل رہا تھا۔ کچھ اس کی حرارت تھی۔ کچھ اس خبر نے ہم کو گرما دیا۔ اسٹوڈیو میں ایک نئی لڑکی کا داخلہ ہمیشہ ایک خوشگوار حادثہ ہوا کرتا ہے چنانچہ ہم سب نیاز محمد ولن کے کمرے سے نکل کر باہر چلے آئے تاکہ اس کا دیدار کیا جائے۔

شام کے وقت جب سیٹھ ہرمزجی فرام جی آفس سے نکل کر طلسمی طبلچی کی چاندی کی ڈبیا سے دو خوشبودار تمباکو والے پان اپنے جبڑے تلے میں دبا کر بلیرڈ کھیلنے کے کمرے کا رخ کر رہے تھے کہ یہیں وہ نئی لڑکی نظر آئی۔ سانولے رنگ کی عورت تھی، بس میں صرف اتنا ہی دیکھ سکا۔ کیونکہ وہ جلدی جلدی سیٹھ کے ساتھ ہاتھ ملا کر اسٹوڈیو کی موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی۔

—— کچھ دیر کے بعد مجھے نیاز محمد نے بتایا کہ اس عورت کے ہونٹ موٹے تھے۔ وہ غالباً صرف ہونٹ ہی دیکھ سکا تھا۔ استاد جس نے شاید اتنی جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔ سر ہلا کر بولا "ہونہہ —— کنڈم" —— یعنی بکواس ہے۔

چار پانچ روز گزر گئے مگر یہ نئی لڑکی اسٹوڈیو میں نہ آئی، پانچویں یا چھٹے روز جب میں گلاب کے ہوٹل سے چائے پی کر نکل رہا تھا۔ اچانک میری اور اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔

میں ہمیشہ عورتوں کو چور آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ اگر کوئی عورت ایک دم میرے سامنے آجائے تو مجھے اس کا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ چونکہ غیر متوقع طور پر میری اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ اس لئے میں اس کی شکل و شباہت کے متعلق کوئی اندازہ نہ کر سکا۔ البتہ پاؤں میں نے ضرور دیکھے۔ جن میں نئی وضع کے سلیپر تھے۔

لیبارٹری سے اسٹوڈیو تک جو روش جاتی ہے اس پر مالکوں نے بجری بچھا رکھی ہے۔ اس بجری میں بے شمار گول گول بٹیاں ہیں۔ جن پر سے جوتا بار بار پھسلتا ہے چونکہ اس کے پاؤں میں کھلے سلیپر تھے اس لئے چلنے میں اسے کچھ زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

اس ملاقات کے بعد آہستہ آہستہ مس نیلم سے میری دوستی ہو گئی۔ اسٹوڈیو کے لوگوں کو تو خیر اس کا علم نہیں تھا مگر اس کے ساتھ میرے تعلقات بہت ہی بے تکلف تھے۔ اس کا اصلی نام رادھا تھا۔ میں نے جب ایک بار اس سے پوچھا کہ تم نے اتنا پیارا نام کیوں چھوڑ دیا؟ تو اس نے جواب دیا "یونہی......" مگر پھر دیر کے بعد کہا "یہ نام اتنا پیارا ہے کہ فلم میں استعمال نہیں کرنا چاہیے"

آپ شاید خیال کریں کہ رادھا مذہبی خیال کی عورت تھی۔ جی نہیں اسے مذہب اور اس کے توہمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن جس طرح میں ہر نئی تحریر شروع کرنے سے پہلے کاغذ پر بسم اللہ کے اعداد ضرور لکھتا ہوں۔ اسی طرح شاید اسے بھی غیر ارادی طور پر رادھا کے نام سے بے حد پیار تھا۔

چونکہ وہ چاہتی تھی کہ اسے رادھا نہ کہا جائے۔ اس لئے میں آگے چل کر اسے نیلم ہی کہوں گا۔

نیلم بنارس کی ایک طوائف زادی تھی۔ وہیں کا لب لہجہ جو کانوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میرا نام سعادت ہے۔ مگر وہ مجھے ہمیشہ صادق ہی کہا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے کہا تھا "نیلم میں جانتا ہوں تم مجھے سعادت کہہ سکتی ہو۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اپنی اصلاح کیوں نہیں کرتیں" یہ سن کر اس کے سانولے ہونٹوں پر جو بہت ہی پتلے تھے۔ ایک خفیف سی پُر اسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے جواب دیا "جو غلطی مجھ سے ایک بار ہو جائے میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کیا کرتی"

میرا خیال ہے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ عورت جسے اسٹوڈیو کے

تمام لوگ ایک معمولی ایکٹریس سمجھتے تھے ۔ عجیب و غریب قسم کی انفرادیت کی مالک تھی اس میں دوسری ایکٹریسوں کا سا اوچھا پن بالکل نہیں تھا ۔ اس کی سنجیدگی جسے اسٹوڈیو کا ہر شخص اپنی عینک سے بالکل غلط رنگ میں دیکھتا تھا ۔ بہت پیاری چیز تھی ۔

اس کے سانولے چہرے پر جس کی جلد بہت ہی صاف اور ہموار تھی ۔ یہ سنجیدگی ، یہ ملیح متانت موزوں و مناسب غازہ بن گئی تھی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے اس کی آنکھوں میں ۔ اس کے پتلے ہونٹوں کے کونوں میں ، غم کی بے معلوم تلخیاں گھل گئی تھیں ۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اسی چیز نے اسے دوسری عورتوں سے بالکل مختلف کر دیا تھا ۔

میں اس وقت بھی حیران تھا اور اب بھی ویسا ہی حیران ہوں کہ نیلم کو "بن کی سندری" میں ویمپ کے رول کے لئے کیوں منتخب کیا گیا اس لئے کہ اس میں تیزی و طراری نام کو بھی نہیں تھی ۔ جب وہ پہلی مرتبہ اپنا واہیات پارٹ ادا کرنے کے لئے تنگ چولی پہن کر سیٹ پر آئی تو میری نگاہوں کو بہت صدمہ پہنچا ۔ وہ دوسروں کا ردِ عمل فوراً تاڑ جایا کرتی تھی ۔ چنانچہ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا "ڈائرکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہارا پارٹ چونکہ شریف عورت کا نہیں ہے ۔ اس لئے تمہیں اس قسم کا لباس دیا گیا ہے ۔ میں نے ان سے کہا ۔ اگر یہ لباس ہے تو میں آپ کے ساتھ ننگی چلنے کے لئے تیار ہوں "

میں نے اس سے پوچھا "ڈائرکٹر صاحب نے یہ سن کر کیا کہا ؟"

نیلم کے پتلے ہونٹوں پر ایک خفیف سی پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی "انھوں نے تصور میں مجھے ننگی دیکھنا شروع کر دیا ۔۔۔ یہ لوگ بھی

کتنے احمق ہیں۔ یعنی اس لباس میں مجھے دیکھ کر بے چارے تصور پر زور ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟"

ذہنی تیاری کے لئے نیلم کا اتنا تعارف ہی کافی ہے۔ اب میں ان واقعات کی طرف آتا ہوں۔ جن کی مدد سے میں یہ کہانی مکمل کرنا چاہتا ہوں۔

بمبئی میں جون کے مہینے سے بارش شروع ہو جاتی ہے اور ستمبر کے وسط تک جاری رہتی ہے۔ پہلے دو ڈھائی مہینوں میں اس قدر پانی برستا ہے کہ اسٹوڈیو میں کام نہیں ہو سکتا۔ "بن کی سندری" کی شوٹنگ اپریل کے اواخر میں شروع ہوئی تھی۔ جب پہلی بارش ہوئی تو ہم اپنا تیسرا سیٹ مکمل کر رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا سین باقی رہ گیا تھا۔ جس میں کوئی مکالمہ نہیں تھا۔ اس لئے بارش میں بھی ہم نے اپنا کام جاری رکھا مگر جب یہ کام ختم ہو گیا تو ہم ایک عرصے کے لئے بے کار ہو گئے۔

اس دوران میں اسٹوڈیو کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھنے کا بہت موقع ملتا ہے۔ میں تقریباً سارا دن گلاب کے ہوٹل میں بیٹھا چائے پیتا رہتا تھا۔ جو آدمی بھی اندر آتا تھا یا تو سارے کا سارا بھیگا ہوتا تھا یا آدھا ——— باہر کی سب مکھیاں پناہ لینے کے لئے اندر جمع ہو گئی تھیں۔ اس قدر غلیظ فضا تھی کہ الاماں۔ ایک کرسی پر چائے نچوڑنے کا کپڑا پڑا ہے۔ دوسری پر پیاز کاٹنے کی بدبودار چھری پڑی جھک مار رہی ہے۔ گلاب صاحب پاس کھڑے ہیں اور اپنے گوشت خورہ لگے دانتوں تلے بمبئی کی اردو چبا رہے ہیں۔ "تم ادھر جانے کو نہیں سکتا ——— ہم ادھر سے جا کے آیا ...... بہت لفڑا ہوگا ——— ہاں ہم بڑا اواندہ

ہو جائیں گا.....“

اس ہوٹل میں جس کی چھت کو روگیٹیڈ اسٹیل کی تھی۔ سیٹھ ہرمزجی فرام جی ان کے سالے ایڈل جی اور ہیروئنوں کے سوا سب لوگ آتے تھے —
نیاز محمد کو تو دن میں کئی مرتبہ یہاں آنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ چنی منی نام کی دو بلیاں پال رہا تھا۔

راج کشور دن میں ایک چکر لگا جایا کرتا تھا۔ جونہی وہ اپنے لمبے قد اور کسرتی بدن کے ساتھ دہلیز پر نمودار ہوتا میرے سوائے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی آنکھیں تمتما اٹھتیں۔ ایکسٹرا لڑکے اٹھ اٹھ کر راج بھائی کو کرسی پیش کرتے اور جب وہ ان میں سے کسی کی پیش کی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتا تو وہ سارے پروانوں کی مانند اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس کے بعد دو قسم کی باتیں سننے میں آتیں۔ ایکسٹرا لڑکوں کی زبان پر پرانے فلموں میں راج بھائی کے کام کی تعریف کی اور خود راج کشور کی زبان پر اس کے اسکول چھوڑ کر کالج اور کالج چھوڑ کر فلمی دنیا میں داخل ہونے کی تاریخ —— چونکہ مجھے یہ سب باتیں زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ اس لئے جونہی راج کشور ہوٹل میں داخل ہوتا میں اس سے صاحب سلیک کرنے کے بعد باہر نکل جاتا۔

ایک روز جب بارش تھمی ہوئی تھی اور ہرمزجی فرام جی کا السیشین کتا نیاز محمد کی دو بلیوں سے ڈر کر گلاب کے ہوٹل کی طرف دم دبائے بھاگا آرہا تھا۔ میں نے مولسری کے درخت کے نیچے بنے ہوئے گول چبوترے پر نیلم اور راج کشور کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔

راج کشور کھڑا حسب عادت ہولے ہولے جھول رہا تھا جس کا مطلب

یہ تھا کہ وہ اپنے خیال کے مطابق نہایت ہی دلچسپ باتیں کر رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ نیلم سے راج کشور کا تعارف کب اور کس طرح ہوا تھا۔ مگر نیلم تو اُسے فلمی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے ہی اچھی طرح جانتی تھی اور شاید ایک دو مرتبہ اُس نے مجھ سے برسبیل تذکرہ اُس کے متناسب اور خوبصورت جسم کی تعریف بھی کی تھی۔

میں گلاب کے ہوٹل سے نکل کر ریکارڈنگ روم کے پیچھے تک پہنچا تو راج کشور نے اپنے چوڑے کاندھے پر سے کھادی کا تھیلا ایک جھٹکے کے ساتھ اتارا اور اُسے کھول کر ایک موٹی کاپی باہر نکالی۔ میں سمجھ گیا ـــــ یہ راج کشور کی ڈائری تھی۔

ہر روز تمام کاموں سے فارغ ہو کر اپنی سوتیلی ماں کا آشیرواد لے کر راج کشور سونے سے پہلے ڈائری لکھنے کا عادی ہے۔ یوں تو اُسے پنجابی زبان بہت عزیز ہے۔ مگر یہ روزنامچہ انگریزی میں لکھتا ہے جس میں کہیں ٹیگور کے نازک اسٹائل کی اور کہیں گاندھی کے سیاسی طرز کی جھلک نظر آتی ہے ـــــ اس کی تحریر پر شیکسپیئر کے ڈراموں کا اثر بھی کافی ہے۔ مگر مجھے اس مرکب میں لکھنے والے کا خلوص کبھی نظر نہیں آیا۔ اگر یہ ڈائری آپ کو کبھی مل جائے تو آپ کو راج کشور کی زندگی کے دس پندرہ برسوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اُس نے کتنے روپے چندے میں دیئے۔ کتنے غریبوں کو کھانا کھلایا۔ کتنے جلسوں میں شرکت کی، کیا پہنا، کیا اُتارا ـــــ اور اگر میرا قیافہ درست ہے تو آپ کو اس ڈائری کے کسی ورق پر میرے نام کے ساتھ پینتیس روپے بھی نظر آ جائیں گے جو میں نے اُس سے ایک بار قرض لیئے تھے اور اس خیال سے ابھی تک واپس نہیں کیئے کہ وہ اپنی ڈائری میں

ان کی واپسی کا ذکر کبھی نہیں کرے گا۔

خیر ——— نیلم کو وہ اس ڈائری کے چند اوراق پڑھ کر سنا رہا تھا۔ میں نے دور ہی سے اس کے خوبصورت ہونٹوں کی جنبش سے معلوم کر لیا کہ وہ شیکسپیرین انداز میں پربھو کی حمد بیان کر رہا ہے۔

نیلم مولسری کے درخت کے نیچے گول سیمنٹ لگے چبوترے پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کی ملیح متانت پر راج کشور کے الفاظ کوئی اثر پیدا نہیں کر رہے تھے۔

وہ راج کشور کی ابھری ہوئی چھاتی کی طرف دیکھ رہی تھی اس کے کرتے کے بٹن کھلے تھے اور سفید بدن پر اس کی چھاتی کے کالے بال بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔

اسٹوڈیو میں چاروں طرف ہر چیز دھلی ہوئی تھی۔ نیاز محمد کی دو بلیاں بھی جو عام طور پر غلیظ رہا کرتی تھیں۔ اس روز بہت صاف ستھری دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں سامنے بنچ پر لیٹی نرم نرم پنجوں سے اپنا منہ دھو رہی تھیں۔ نیلم جارجٹ کی بے داغ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ بلاؤز سفید لٹھے کا تھا جو اس کی سانولی اور سڈول باہنوں کے ساتھ ایک نہایت ہی خوشگوار اور مدھم سا تضاد پیدا کر رہا تھا۔

"نیلم اتنی مختلف کیوں دکھائی دے رہی ہے۔؟"

ایک لحظے کے لئے یہ سوال میرے دماغ میں پیدا ہوا اور جب ایک دم اس کی اور میری آنکھیں چار ہوئیں تو مجھے اس کی نگاہ کے اضطراب میں اپنے سوال کا جواب مل گیا ——— نیلم محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں

ہوئیں۔ جب راج کشور چلا گیا تو اُس نے مجھ سے کہا "آج آپ میرے ساتھ چلئے گا"
شام کو چھ بجے میں نیلم کے مکان پر تھا۔ جونہی ہم اندر داخل ہوئے۔ اس نے اپنا بیگ صوفے پر پھینکا اور مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا "آپ نے جو کچھ سوچا ہے غلط ہے"
میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے جواب دیا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے کیا سوچا تھا"
اس کے پتلے ہونٹوں پر خفیف سی پُراسرار مسکراہٹ پیدا ہوئی۔
"اس لئے کہ ہم دونوں نے ایک ہی بات سوچی تھی۔ آپ نے شاید بعد میں غور نہیں کیا۔ مگر میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہم دونوں غلط تھے۔"
"اگر میں کہوں کہ ہم دونوں صحیح تھے"
اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "تو ہم دونوں بے وقوف ہیں"
یہ کہہ کر فوراً ہی اس کے چہرے کی سنجیدگی اور زیادہ سنولا گئی "صادق یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں بچی ہوں جو مجھے اپنے دل کا حال معلوم نہیں ــــ تمہارے خیال کے مطابق میری عمر کیا ہوگی۔؟"
"بائیس برس"
"بالکل درست ــــ لیکن تم نہیں جانتے کہ دس برس کی عمر میں مجھے محبت کے معنی معلوم تھے ــــ معنی کیا ہوئے جی ــــ خدا کی قسم میں محبت کرتی تھی ــ دس سے لے کر سولہ برس تک میں ایک خطرناک محبت میں گرفتار رہی ہوں ــ میرے دل میں اب کیا خاک کسی کی محبت پیدا ہوگی۔
یہ کہہ کر اس نے میرے منجمد چہرے کی طرف دیکھا اور مضطرب ہوکر کہا "تم کبھی

نہیں مانوگے، میں تمہارے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دوں۔ پھر بھی تم یقین نہیں کروگے۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں...... بھئی خدا کی قسم، وہ مرجائے جو تم سے جھوٹ بولے........ میرے دل میں اب کسی کی محبت پیدا نہیں ہوسکتی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ......" یہ کہتے کہتے وہ ایک دم رُک گئی۔

میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ وہ گہرے فکر میں غرق ہوگئی تھی۔ وہ شاید سوچ رہی تھی کہ "اتنا ضرور" کیا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد اس کے پتلے ہونٹوں پر دبی خفیف پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی جس سے اس کے چہرے کی سنجیدگی میں تھوڑی سی عالمانہ شرارت پیدا ہوجاتی تھی۔ صوفے پر سے ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کر اس نے کہنا شروع کیا "میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ یہ محبت نہیں ہے کوئی اور بلا ہو تو میں کہہ نہیں سکتی........ صادق میں تمہیں یقین دلاتی ہوں"

میں نے فوراً ہی کہا "یعنی تم اپنے آپ کو یقین دلاتی ہو"

وہ جل گئی۔ "تم بہت کمینے ہو...... کہنے کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔ آخر تمہیں یقین دلانے کی مجھے ضرورت ہی کیا پڑی ہے...... میں اپنے کو یقین دلا رہی ہوں مگر مصیبت یہ ہے کہ آرام نہیں رہا۔ اللہ! کیا تم میری مدد نہیں کرسکتے؟"...... یہ کہہ کر وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور داہنے ہاتھ کی چھنگلیا پکڑ کر مجھ سے پوچھنے لگی "راج کشور کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ـــــ میرا مطلب ہے تمہارے خیال کے مطابق راج کشور میں وہ کون سی چیز ہے جو مجھے پسند آئی ہے ـــــ" چھنگلیا چھوڑ کر اس نے ایک ایک کرکے دوسری انگلیاں پکڑنی شروع کیں "مجھے اس کی باتیں پسند نہیں۔

— مجھے اس کی ایکٹنگ پسند نہیں — مجھے اس کی ڈائری پسند نہیں جانے آج کیا خرافات سنا رہا تھا" خود ہی تنگ آ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی "سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا ہو گیا ہے — بس صرف یہ جی چاہتا ہے کہ ایک ہنگامہ ہو، بلیوں کی لڑائی کی طرح شور مچے، دھول اڑے۔ اور میں پسینہ پسینہ ہو جاؤں ...... " پھر ایک دم وہ میری طرف پلٹی " صادق — تمہارا کیا خیال ہے — میں کیسی عورت ہوں ؟ "

میں نے مسکرا کر جواب دیا " بلیاں اور عورتیں میری سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہی ہیں۔ "

اس نے ایک دم پوچھا " کیوں ؟ "

میں نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا " ہمارے گھر میں ایک بلی رہتی تھی۔ سال میں ایک مرتبہ اس پر رونے کے دورے پڑتے تھے۔ اس کا رونا دھونا سن کر کہیں سے ایک بلا آ جایا کرتا تھا۔ پھر ان دونوں میں سخت لڑائی اور خون خرابہ ہوتا کہ الاماں .... مگر اس کے بعد وہ خالہ بلی چار بچوں کی ماں بن جایا کرتی تھی۔ "

نیلم کا جیسے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا " تھو..... تم کتنے گندے ہو " پھر تھوڑی دیر کے بعد الائچی سے منہ کا ذائقہ درست کرنے کے بعد اس نے کہا " مجھے اولاد سے نفرت ہے — خیر ہٹاؤ جی اس قصے کو "

یہ کہہ کر نیلم نے پاندان کھول کر اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے میرے لئے پان لگانا شروع کر دیا۔ چاندی کی چھوٹی سی کلیوں میں سے اس نے بڑی نفاست سے چمچی کے ساتھ چونا اور کتھا نکال کر رگیں نکالے

ہوئے پان پر پھیلایا اور گلوری بنا کر مجھے دی " صادق تمہارا کیا خیال ہے ــــ " ؟

یہ کہہ کر وہ خالی الذہن ہو گئی ۔

میں نے پوچھا " کس بارے میں " ؟

اس نے سروتے سے بھنی ہوئی چھالیہ کاٹتے ہوئے کہا " اسی بکواس کے بارے میں جو خواہ مخواہ شروع ہو گئی ہے ــــ یہ بکواس نہیں تو اور کیا ہے ، یعنی میری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں ــــ خود ہی پھاڑتی ہوں خود ہی رفو کرتی ہوں ــــ اگر یہ بکواس اسی طرح جاری رہی تو جانے کیا ہو گا ــــ تم نہیں جانتے ہو ، میں بہت زبردست عورت ہوں "

" زبردست سے تمہاری کیا مراد ہے ؟ "

نیلم کے پتلے ہونٹوں پر وہی خفیف پراسرار مسکراہٹ پیدا ہوئی ۔

" تم بڑے بے شرم ہو ، سب کچھ سمجھتے ہو ۔ مگر مجھ سے چٹکیاں لے کر مجھے اکساؤ گے ضرور ...... " یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی سفیدی گلابی رنگت اختیار کر گئی ۔ " تم سمجھتے کیوں نہیں کہ میں بہت ..... گرم مزاج کی عورت ہوں " یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی " اب تم جاؤ ــــ میں نہانا چاہتی ہوں "

میں چلا گیا ۔

اس کے بعد نیلم نے بہت دنوں تک راج کشور کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہا ۔ مگر اس دوران میں ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات سے واقف تھے ۔ جو کچھ وہ سوچتی تھی ۔ مجھے معلوم ہو جاتا تھا اور جو کچھ میں سوچتا تھا اسے معلوم ہو جاتا تھا ۔ کئی روز تک یہی خاموش تبادلہ

جاری رہا۔

ایک دن ڈائرکٹر کرپلانی جو "بن کی سندری" بنا رہا تھا، ہیروئن کی ریہرسل سن رہا تھا۔ ہم سب میوزک روم میں جمع تھے۔ نیلم ایک کرسی پر بیٹھی اپنے پاؤں کی جنبش سے ہولے ہولے تال دے رہی تھی۔ ایک بازاری قسم کا گانا تھا، مگر دھن اچھی تھی۔ جب ریہرسل ختم ہوئی تو راج کشور کاندھے پر کھادی کا تھیلا رکھے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈائرکٹر کرپلانی۔ میوزک ڈائرکٹر گھوش، ساؤنڈ ریکارڈسٹ پی۔ این موگھا ——— ان سب کو فرداً فرداً اس نے انگریزی میں آداب کیا، ہیروئن مس عیدن بائی کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور کہا "عیدن بہن کل میں نے آپ کو کرافرڈ مارکیٹ میں دیکھا۔ میں آپ کے بھائی کے لئے موسمبیاں خرید رہا تھا کہ آپ کی موٹر نظر آئی ......" جھولتے جھولتے اس کی نظر نیلم پر پڑی جو پیانو کے پاس ایک بست قد کرسی میں دھنسی ہوئی تھی۔ ایک دم اس کے ہاتھ نمسکار کے لئے اٹھے۔ یہ دیکھتے ہی نیلم اٹھ کھڑی ہوئی "راج صاحب مجھے بہن نہ کہئے گا"

نیلم نے یہ بات کچھ انداز سے کہی کہ میوزک روم میں بیٹھے ہوئے سب آدمی ایک لحظے کے لئے مبہوت ہو گئے۔ راج کشور کھسیانہ سا ہو گیا۔ اور صرف اسقدر کہہ سکا "کیوں؟"

نیلم جواب دیئے بغیر باہر نکل گئی۔

تیسرے روز میں ناگپاڑے میں سہ پہر کے وقت شام لال پنواڑی کی دوکان پر گیا تو وہاں اسی واقعے کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں ——— شام لال بڑے فخریہ لہجے میں کہہ رہا تھا "سالی کا اپنا من میلا ہو گا، ورنہ راج بھائی کسی کو بہن کہے اور وہ برا مانے ...... کچھ بھی ہو اس کی مراد

کبھی پوری نہیں ہوگی۔ راج بھائی لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔"

راج بھائی کے لنگوٹ سے میں بہت تنگ آ گیا تھا۔ مگر میں نے شام لال سے کچھ نہ کہا اور خاموش بیٹھا اس کی اور اس کے دوست گاہکوں کی باتیں سنتا رہا جن میں مبالغہ زیادہ اور اصلیت کم تھی۔

اسٹوڈیو میں ہر شخص کو میوزک روم کے اس حادثے کا علم تھا اور تین روز سے گفتگو کا موضوع بس یہی چیز تھی کہ راج کشور کو مس نیلم نے کیوں ایک دم بہن کہنے سے منع کیا۔ میں نے راج کشور کی زبانی اس بارے میں کچھ نہ کچھ سنا مگر اس کے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اس نے اپنی ڈائری میں اس پر نہایت ہی دلچسپ تبصرہ لکھا ہے اور پراتھنا کی ہے کہ مس نیلم کا دل و دماغ پاک صاف ہو جائے۔

اس حادثے کے بعد کئی دن گذر گئے مگر کوئی قابلِ ذکر بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ نیلم پہلے سے کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی اور راج کشور کے کرتے کے بٹن اب ہر وقت کھلے رہتے تھے جس میں سے اس کی سفید اور ابھری ہوئی چھاتی کے کالے بال باہر جھانکتے رہتے تھے۔

چونکہ ایک دو روز سے بارش تھمی ہوئی تھی اور "بن کی سندری" کا چوتھے سیٹ کا رنگ خشک ہو گیا تھا۔ اس لئے ڈائرکٹر کرپلانی نے نوٹس بورڈ پر شوٹنگ کا اعلان چسپاں کر دیا۔ یہ سین جو اب لیا جانا تھا نیلم اور راج کشور کے درمیان تھا۔ چونکہ میں نے ہی اس کے مکالمے لکھے تھے اس لئے مجھے معلوم تھا کہ راج کشور باتیں کرتے کرتے نیلم کا ہاتھ چومے گا۔ اس سین میں چومنے کی بالکل گنجائش نہ تھی مگر چونکہ عوام کے جذبات کو اکسانے کے لئے عام طور پر فلموں میں عورتوں کو ایسے لباس پہنائے

جاتے ہیں جو لوگوں کو ستائیں۔ اس لئے ڈائرکٹر کرپلانی نے پُرانے نسخے کے مطابق دست بوسی کا یہ ٹچ رکھ دیا تھا۔

جب شوٹنگ شروع ہوئی تو میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سیٹ پر موجود تھا۔ راج کشور اور نیلم دونوں کا ردِّ عمل کیا ہوگا۔ اس کے تصوّر ہی سے میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی مگر سارا سین مکمل ہوگیا۔ اور کچھ نہ ہوا۔ ہر مکالمے کے بعد ایک تھکا دینے والی یک آہنگی کے ساتھ برقی لیمپ روشن اور گل ہو جاتے۔ اسٹارٹ اور کٹ کی آوازیں بلند ہوتیں اور شام کو جب سین کے کلائمکس کا وقت آیا تو راج کشور نے بڑے رومانی انداز میں نیلم کا ہاتھ پکڑا۔ مگر کیمرے کی طرف پیٹھ کرکے اپنا ہاتھ چوم کر الگ کر دیا۔

میرا خیال تھا کہ نیلم اپنا ہاتھ کھینچ کر راج کشور کے منہ پر ایک ایسا چانٹا جڑ دے گی کہ ریکارڈ روم میں پی۔ این موگھا کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے مگر اس کے برعکس مجھے نیلم کے پتلے ہونٹوں پر ایک تحلیل شدہ مسکراہٹ دکھائی دی جس میں عورت کے مجروح جذبات کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔

مجھے سخت ناامیدی ہوئی تھی۔ مگر میں نے اس کا ذکر نیلم سے نہ کیا۔ دو تین روز گذر گئے اور جب اس نے بھی مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ کہا۔ تو میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسے اس ہاتھ چومنے والی بات کی اہمیت کا علم ہی نہیں تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کے ذکی الحس دماغ میں اس کا خیال تک بھی نہ آیا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اس وقت راج کشور کی زبان سے جو عورت کو بہن کہنے کا عادی تھا۔ عاشقانہ الفاظ سن رہی تھی۔

نیلم کا ہاتھ چومنے کی بجائے راج کشور نے اپنا ہاتھ کیوں چوما تھا — کیا

اس نے انتقام لیا تھا؟ —— کیا اس نے اس عورت کو ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی؟ —— ایسے کئی سوال میرے دماغ میں پیدا ہوئے۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔

چوتھے روز جب میں حسبِ معمول ناگپاڑے میں شام لال کی دوکان پر گیا تو اس نے مجھ سے شکایت بھرے لہجے میں کہا "منٹو صاحب آپ تو ہمیں اپنی کمپنی کی کوئی بات سناتے ہی نہیں —— آپ بتانا نہیں چاہتے یا پھر آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا..........

پتا ہے آپ کو۔ راج بھائی نے کیا کیا؟"

اس کے بعد اس نے اپنے انداز میں یہ کہانی بیان کرنا شروع کی۔ کہ "بن کی سندری" میں ایک سین تھا جس میں ڈائرکٹر صاحب نے راج بھائی کو مس نیلم کا منہ چومنے کا آرڈر دیا۔ لیکن صاحب کہاں راج بھائی اور کہاں وہ سالی شکھیائی۔ راج بھائی نے فوراً کہہ دیا "نا صاحب میں ایسا کام نہیں کروں گا۔ میری اپنی پتنی ہے۔ اس گندی عورت کا منہ چوم کر کیا میں اس کے پوتر ہونٹوں سے اپنے ہونٹ ملا سکتا ہوں.......... بس صاحب فوراً ڈائرکٹر صاحب کو سین بدلنا پڑا۔ اور راج بھائی سے کہا گیا کہ اچھا بھئی تم منہ نہ چومو ہاتھ چوم لو مگر راج بھائی نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں جب وقت آیا تو اس نے اس صفائی سے اپنا ہاتھ چوما کہ دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہوا کہ اس نے اس سالی کا ہاتھ چوما ہے۔"

میں نے اس گفتگو کا ذکر نیلم سے نہ کیا۔ اس لئے کہ جب وہ اس سارے قصے ہی سے بے خبر تھی۔ اسے خواہ مخواہ رنجیدہ کرنے سے کیا فائدہ۔

بمبئی میں ملیریا عام ہے۔ معلوم نہیں، کون سا مہینہ تھا اور کون سی

تاریخ تھی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ "بن کی سندری" کا پانچواں سیٹ لگ رہا تھا اور بارش بڑے زوروں پر تھی کہ نیلم اچانک بہت تیز بخار میں مبتلا ہوگئی۔ چونکہ مجھے اسٹوڈیو میں کوئی کام نہیں تھا۔ اس لئے میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا اس کی تیمارداری کرتا رہتا۔ ملیریا نے اس کے چہرے کی سنولاہٹ میں ایک عجیب قسم کی درد انگیز زردی پیدا کردی تھی۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں اور اس کے پتلے ہونٹوں کے کونوں میں جو نا قابلِ بیان تلخیاں گھلی رہتی تھیں۔ اب اُن میں ایک بے معلوم بے بسی کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔

کونین کے ٹیکوں سے اس کی سماعت کسی قدر کمزور ہوگئی تھی۔ چنانچہ اُسے اپنی نحیف آواز اونچی کرنا پڑتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میرے کان بھی خراب ہوگئے ہیں۔

ایک دن جب اس کا بخار بالکل دور ہوگیا تھا اور وہ بستر پر لیٹی نقاہت بھرے لہجے میں عیدن بائی کی بیمار پرسی کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ نیچے سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ یہ آواز سن کر نیلم کے بدن پر ایک سرد جھرجھری سی دوڑ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد کمرے کا دبیز ساگوانی دروازہ کھلا اور راج کشور کھادی کے سفید کرتے اور تنگ پائجامے میں اپنی پرانی وضع کی بیوی کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔

عیدن بائی کو عیدن بہن کہہ کر سلام کیا۔ میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اور اپنی بیوی کو جو تیکھے تیکھے نقشوں والی گھریلو قسم کی عورت تھی ہم سے متعارف کرا کے وہ نیلم کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ چند لمحات وہ ایسے ہی

خلا میں مسکراتا رہا۔ پھر اس نے بیمار نیلم کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی مرتبہ اس کی ڈھلی ہوئی آنکھوں میں ایک گرد آلود جذبہ تیرتا ہوا پایا۔

میں ابھی پوری طرح متحیّر بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس نے کھلنڈرے انداز میں کہنا شروع کیا " بہت دنوں سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی بیمار پرسی کے لئے آؤں مگر اس کم بخت موٹر کا انجن کچھ ایسا خراب ہوا کہ دس دن کارخانے میں پڑی رہی۔ آج آئی تو میں نے (اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے) شانتی سے کہا بھئی چلو اسی وقت اٹھو ـــــ رسوئی کا کام کوئی اور کرے گا۔ آج اتفاق سے رکھشا بندھن کا تہوار بھی ہے ـــــ نیلم بہن کی خیر و عافیت بھی پوچھ آئیں گے۔ اور ان سے رکھشا بھی بندھوائیں گے ـــــ "

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کھادی کے کرتے سے ایک ریشمی پھندنے والا گجرا نکالا ـــــ نیلم کے چہرے کی زردی اور زیادہ دردانگیز ہو گئی۔

راج کشور جان بوجھ کر نیلم کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے عیدن بائی سے کہا " مگر ایسے نہیں۔ خوشی کا موقعہ ہے، بہن بیمار ہے تو کیا ہوا۔ رکھشا نہیں باندھے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شانتی چلو اٹھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کو لپ اسٹک وغیرہ لگاؤ ـــــ میک اپ بکس کہاں ہے ؟ "

سامنے مینٹل پیس پر نیلم کا میک اپ بکس پڑا تھا۔ راج کشور نے چند لمبے لمبے قدم اٹھائے اور اسے لے آیا۔ نیلم خاموش تھی۔ اس کے پتلے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ جیسے وہ اپنی چیخیں بڑی مشکل سے روک رہی ہے۔

جب شانتی نے پتی ورتا استری کی طرح اٹھ کر نیلم کا میک اپ کرنا چاہا تو اس نے کوئی مزاحمت پیش نہ کی۔ عیدن بائی نے ایک بے جان لاش

کو سہارا دیکر اٹھایا اور جب شانتی نے نہایت ہی غیر صناعانہ طریق پر اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانا شروع کی تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی ...... نیلم کی یہ مسکراہٹ ایک خاموش چیخ تھی -

میرا خیال تھا ـــــ نہیں مجھے یقین تھا کہ ایک دم کچھ ہوگا.... نیلم کے بھنچے ہوئے ہونٹ ایک دھماکے کے ساتھ وا ہوں گے اور جس طرح برسات میں پہاڑی نالے بڑے بڑے مضبوط بند توڑ کر دیوانہ وار آگے نکل جاتے ہیں - اسی طرح نیلم اپنے رُکے ہوئے جذبات کے طوفانی بہاؤ میں ہم سب کے قدم اکھیڑ کر خدا معلوم کن گہرائیوں میں دھکیل لے جائے گی. مگر تعجب ہے کہ وہ بالکل خاموش رہی ـــــ اس کے چہرے کی درد انگیز زردی غازے اور سرخی کے غبار میں چھپتی رہی اور وہ پتھر کے بُت کی طرح بے حس بنی رہی - آخر میں جب میک اپ مکمل ہو گیا تو اس نے راج کشور سے بات انگیز طور پر مضبوط لہجے میں کہا " لائیے، اب میں رکھشا باندھ دوں "

ریشمی پھندنوں والا کنگرا تھوڑی دیر میں راج کشور کی کلائی میں تھا. اور نیلم جس کے ہاتھ کانپنے چاہئیں تھے - بڑے سنگین سکون کے ساتھ اس کا تاگہ بند کر رہی تھی - اس عمل کے دوران ایک مرتبہ پھر مجھے راج کشور کی کھِلی ہوئی آنکھوں میں ایک گرد آلود جذبے کی جھلک نظر آئی جو فوراً ہی اس کی ہنسی اور تبسم میں ڈوب گئی -

راج کشور نے ایک لفافے میں رسم کے مطابق نیلم کو کچھ روپے دیئے جو اس نے شکریہ ادا کر کے اپنے تکئیے کے نیچے رکھ لئے ـــــ جب وہ لوگ چلے گئے - میں اور نیلم اکیلے رہ گئے تو اس نے مجھ پر ایک اجڑی ہوئی نگاہ ڈالی تھی وہ مسرور تھی مگر خاموش لیٹ گئی - پلنگ پر راج کشور اپنا تھیلا بھول گیا

تھا۔ جب نیلم نے اسے دیکھا تو پاؤں سے ایک طرف کر دیا۔ میں تقریباً دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ جب اس نے کوئی بات نہ کی تو میں رخصت لئے بغیر چلا گیا۔

اس واقعے کے تین روز بعد میں ناگپاڑے میں اپنی نو روپے ماہوار کی کھولی کے اندر بیٹھا شیو کر رہا تھا اور دوسری کھولی سے اپنی ہمسائی مسز فرنینڈیز کی گالیاں سن رہا تھا کہ ایک دم کوئی اندر داخل ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ——— نیلم تھی۔

ایک لحظے کے لئے میں نے خیال کیا کہ نہیں کوئی اور ہے ——— اس کے ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے منہ سے خون نکل نکل کر بہتا رہا ہے اور پونچھا نہیں گیا ——— سر کا ایک بال بھی صحیح حالت میں نہیں تھا۔ سفید ساڑھی کی بوٹیاں اڑی ہوئی تھیں بلاؤز کے تین چار ہک کھلے تھے۔ اور اس کی سانولی چھاتیوں پر خراشیں نظر آ رہی تھیں۔

نیلم کو اس حالت میں دیکھ کر مجھ سے پوچھا ہی نہ گیا کہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ اور میری کھولی کا پتہ لگا کر تم کیسے پہنچی ہو۔

پہلا کام میں نے یہ کیا کہ دروازہ بند کر دیا۔

جب میں کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھا تو اس نے اپنے لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے ہونٹ کھولے اور کہا "میں سیدھی یہاں آ رہی ہوں۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا "کہاں سے؟"

"اپنے مکان سے ...... اور میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ اب وہ بکواس جو شروع ہوئی تھی ختم ہو گئی ہے "

"کیسے ؟"

"مجھے معلوم تھا کہ وہ پھر میرے مکان پر آئے گا۔ اس وقت جب اور کوئی نہیں ہو گا۔ چنانچہ وہ آیا ...... اپنا تھیلا لینے کے لئے ―" یہ کہتے ہوئے اس کے پتلے ہونٹوں پر جو لپ اسٹک نے بالکل بے شکل کر دیئے تھے، وہی خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ۔ " وہ اپنا تھیلا لینے آیا تھا۔ میں نے کہا چلیے دوسرے کمرے میں پڑا ہے۔ میرا لہجہ شاید بدلا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ کچھ گھبرا سا گیا ...... میں نے کہا گھبرایئے نہیں ..... جب ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں تھیلا دینے کی بجائے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور میک اپ کرنا شروع کر دیا ―― یہاں تک کہا کر وہ خاموش ہو گئی ―― سامنے میرے ٹوٹے ہوئے میز پر شیشے کے گلاس میں پانی پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر نیلم غٹا غٹ پی گئی اور ساڑھی کے پلو سے ہونٹ پونچھ کر اس نے پھر اپنا سلسلۂ کلام جاری کیا " میں ایک گھنٹے تک میک اپ کرتی رہی۔ جتنی لپ اسٹک ہونٹوں پر تھپ سکتی تھی، میں نے تھوپی ...... جتنی سرخی میرے گالوں پر چڑھ سکتی تھی، میں نے چڑھائی۔ وہ خاموش ایک کونے میں کھڑا آئینے پر میری شکل دیکھتا رہا۔ جب میں بالکل چڑیل بن گئی تو مضبوط قدموں کے ساتھ چل کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔"

"پھر کیا ہوا ؟"

میں نے جب سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے نیلم کی طرف دیکھا تو وہ مجھے بالکل مختلف نظر آئی ۔ ساڑھی سے ہونٹ پونچھنے کے بعد اس کے

ہونٹوں کی رنگت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا لہجہ اتنا ہی دیا ہوا تھا جتنا سرخ گرم کئے ہوئے لوہے کا جسے ہتھوڑے سے کوٹا جا رہا ہو۔ —— اس وقت تو وہ چڑیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن جب اس نے میک اپ کیا ہوگا تو ضرور چڑیل دکھائی دیتی ہوگی۔

میرے سوال کا جواب اس نے فوراً ہی نہ دیا —— ٹاٹ کی چارپائی سے اٹھ کر وہ میرے میز پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ "میں نے اس کو جھنجھوڑ دیا۔ ...... جنگلی بلی کی طرح میں اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ اس نے میرا منہ نوچا۔ میں نے اس کا ...... بہت دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کشتی لڑتے رہے ...... اوہ ...... اس میں بلا کی طاقت تھی ...... لیکن ...... لیکن ...... جیسا کہ میں تم سے ایک بار کہہ چکی ہوں ...... میں بہت زبردست عورت ہوں ...... میری کمزوری ...... وہ کمزوری جو ملیریا نے پیدا کی تھی مجھے بالکل محسوس نہ ہوئی —— میرا بدن تپ رہا تھا۔ میری آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں ...... میری ہڈیاں سخت ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے پکڑ لیا —— میں نے اس سے بلیوں کی طرح لڑنا شروع کیا ...... مجھے معلوم نہیں تھا کیوں —— مجھے پتہ نہیں تھا کس لئے —— بے سوچے سمجھے میں اس سے بھڑ گئی ...... ہم دونوں نے کوئی بھی ایسی بات زبان سے نہ نکالی جس کا مطلب کوئی دوسرا سمجھ سکے —— میں چیختی رہی ...... وہ صرف ہوں ہوں کرتا رہا ...... اس کے سفید کھادی کے کرتے کی کئی بوٹیاں میں نے ان انگلیوں سے نوچیں ...... اس نے میرے بال ...... میری کئی لٹیں جڑ سے نکال ڈالیں ......

اس نے اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ مگر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ فتح میری ہو گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ وہ قالین پر مردے کی طرح لیٹا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں اس قدر ہانپ رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ میرا سانس ایک دم رُک جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اتنا ہانپتے ہوئے بھی میں نے اس کے کرتے کو چندی چندی کر دیا۔ اُس وقت جب میں نے اس کا چوڑا چکلا سینہ دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بکواس کیا تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی بکواس جس کے متعلق ہم دونوں سوچتے تھے اور کچھ سمجھ نہیں سکتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سر کی جنبش سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہنے لگی ۔ ۔ ۔ " صادق ۔ ۔ ۔ کم بخت کا جسم واقعی خوبصورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جانے مجھے کیا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دم میں اس پر جھکی اور اُسے کاٹنا شروع کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ سی سی کرتا رہا۔ لیکن جب میں نے اس کے ہونٹوں سے اپنے لہو بھرے ہونٹ پیوست کئے اور اُسے ایک خطرناک جلتا ہوا بوسہ دیا تو وہ انجام رسیدہ عورت کی طرح ٹھنڈا ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اس سے ایک دم نفرت پیدا ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے پورے قد سے اس کی طرف نیچے دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے خوبصورت بدن پر میرے لہو اور لپ اسٹک کی سرخی نے بہت ہی بد نما بیل بوٹے بنا دیئے تھے ۔ ۔ میں نے اپنے کمرے کی طرف دیکھا تو ہر چیز مصنوعی نظر آئی۔ چنانچہ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا کہ شاید میرا دم گھٹ جائے گا اور سیدھی تمہارے پاس چلی آئی ۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مردے کی طرح خاموش ۔ میں ڈر گیا ۔ اس کا ایک ہاتھ جو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا میں نے چھوا ۔ آگ کی

طرح گرم تھا۔

"نیلم..... نیلم...."

میں نے کئی دفعہ اسے زور زور سے پکارا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر جب میں نے بہت زور سے خوف زدہ آواز میں نیلم کہا تو وہ چونکی اور اٹھ کر جاتے ہوئے اس نے صرف اس قدر کہا "سعادت! میرا نام رادھا ہے۔"

~ ⁂ ~

جانکی

پونہ میں ریسوں کا موسم شروع ہونے والا تھا کہ پشاور سے عزیز نے لکھا کہ میں اپنی ایک جان پہچان کی عورت جانکی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں اُس کو یا تو پونہ میں یا بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں ملازم کرادو۔ تمہاری واقفیت کافی ہے' امید ہے تمہیں زیادہ دِقت نہیں ہوگی۔

دِقت کا تو اتنا سوال نہیں تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ فلم کمپنیوں میں اکثر وہی آدمی عورتیں لے کر آتے ہیں جنھیں ان کی کمائی کھانا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں بہت گھبرایا لیکن پھر میں نے سوچا عزیز اتنا پرانا دوست ہے۔ جانے کس یقین کے ساتھ بھیجا ہے۔ اس کو مایوس نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ سوچ کر بھی ایک گونہ تسکین ہوئی کہ عورت کے لئے اگر وہ جوان ہو ہر فلم کمپنی کے دروازے کھلے ہیں۔ اتنی تردد کی بات ہی کیا ہے

میری مدد کے بغیر ہی اُسے کسی نہ کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے گی۔

خط ملنے کے چوتھے روز وہ پونہ پہنچ گئی۔ کتنا لمبا سفر طے کرکے آئی تھی پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پونہ۔ پلیٹ فارم پر چونکہ اس کو مجھے پہچاننا تھا اس لئے گاڑی آنے پر میں نے ایک سرے سے ڈبوں کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ مجھے زیادہ دور نہ چلنا پڑا کیونکہ سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے ایک متوسط قد کی عورت جس کے ہاتھ میں میری تصویر تھی اُتری۔ میری طرف سے پیٹھ کرکے وہ کھڑی ہوگئی۔ اور ایڑیاں اونچی کرکے ہجوم میں مجھے تلاش کرنے لگی۔ میں نے قریب جاکر کہا "جسے آپ ڈھونڈ رہی ہیں وہ غالباً میں ہی ہوں"

وہ پلٹی "اوہ آپ" ایک نظر میری تصویر کی طرف دیکھا اور بڑے بے تکلف انداز میں کہا "سعادت صاحب سفر بہت ہی لمبا تھا۔ بمبئے میں فرنٹیر میل سے اتر کر اس گاڑی کے انتظار میں جو وقت کاٹنا پڑا اُس نے طبعیت صاف کردی۔"

میں نے کہا "اسباب کہاں ہے آپ کا؟"

"لاتی ہوں —" یہ کہہ کر وہ ڈبے کے اندر داخل ہوئی۔ دو سوٹ کیس اور ایک بستر نکالا۔ میں نے قلی بلوایا اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا "میں ہوٹل میں ٹھہروں گی"

میں نے اسٹیشن کے سامنے ہی اس کے لئے ایک کمرے کا بندوبست کردیا۔ اُسے غسل وغیرہ کرکے کپڑے تبدیل کرنے تھے اور آرام کرنا تھا اس لئے میں نے اسے اپنا ایڈریس دیا اور یہ کہہ کر کہ صبح دس بجے مجھ سے ملے ہوٹل سے چل دیا

صبح ساڑھے دس بجے وہ پربھات نگر جہاں میں ایک دوست

کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ آئی جگہ تلاش کرتے ہوئے اُسے دیر ہو گئی تھی۔ میرا دوست اس چھوٹے سے فلیٹ میں جو نیا نیا بنا تھا موجود نہیں تھا۔ میں رات دیر تک لکھنے کا کام کرنے کے باعث صبح دیر سے جاگا تھا اس لئے ساڑھے دس بجے نہا دھو کر چائے پی رہا تھا کہ وہ اچانک اندر داخل ہوئی۔

پلیٹ فارم پر اور ہوٹل میں تھکاوٹ کے باوجود وہ جاندار عورت تھی مگر جونہی وہ اس کمرے میں جہاں میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے چائے پی رہا تھا، داخل ہوئی تو اس کی طرف دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت ہی پریشان اور خستہ حال عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔

جب میں نے اُسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا تو زندگی سے بھرپور تھی۔ لیکن جب پرسھات نگر کے نمبر گیارہ فلیٹ میں آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یا تو اس نے خیرات میں اپنا دس پندرہ اونس خون دے دیا ہے یا اس کا اسقاط ہو گیا ہے۔

جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا سوائے ایک بے وقوف نوکر کے۔ میرے دوست کا گھر جس میں ایک فلمی کہانی لکھنے کے لئے ٹھہرا ہوا تھا بالکل سنسان تھا اور مجید ایک ایسا نوکر تھا جس کی موجودگی ویرانی میں اضافہ کرتی تھی۔

میں نے چائے کی ایک پیالی بنا کر جانکی کو دی اور کہا "ہوٹل سے تو آپ ناشتہ کر کے آئی ہوں گی، پھر بھی شوق فرمائیے۔"

اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی اور پینا شروع کی۔ اس کی داہنی ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن ہچکچاتی ہے۔ میں نے سوچا شاید ہوٹل میں رات کو کسی مسافر نے

اسے چھیڑا ہے۔ چنانچہ میں نے کہا۔" آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں بڑی ہوٹل میں ؟"

" جی ؟ ــــــ جی نہیں !"

میں یہ مختصر جواب سن کر خاموش رہا۔ چائے ختم ہوئی تو میں نے سوچا اب کوئی بات کرنی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے پوچھا " عزیز صاحب کیسے ہیں "

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لفظوں کو جلدی جلدی ادا کر کے کہا " منٹو صاحب! آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتے ہیں ۔ ؟"

میں نے جواب دیا " پونہ میں تو میں کسی کو نہیں جانتا "

" اوہ !"

میں نے پوچھا " کیوں ؟ بیمار ہیں آپ ؟ "

" جی ہاں " وہ کرسی پر بیٹھ گئی ۔

میں نے دریافت کیا " کیا تکلیف ہے ؟ "

اس کے تیکھے ہونٹ جو مسکراتے وقت سکڑ جاتے تھے یا سکیڑ لئے جاتے تھے وا ہوئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی اور اٹھ کھڑی ہوئی پھر میرا سگرٹ کا ڈبہ اٹھایا اور ایک سگرٹ سلگا کر کہا " معاف کیجئے گا میں سگرٹ پیا کرتی ہوں "

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف سگرٹ پیا ہی نہیں کرتی تھی بلکہ مردوں کی طرح سگرٹ انگلیوں میں دبا کر وہ زور زور سے کش لیتی اور ایک دن میں تقریباً بچھتر سگرٹوں کا دھواں کھینچتی تھی۔

میں نے کہا " آپ بتاتی کیوں نہیں کہ آپ کو تکلیف کیا ہے ؟"

اس نے کنواری لڑکیوں کی طرح جھنجھلا کر اپنا ایک پاؤں فرش پر مارا۔
"ہائے اللہ، میں کیسے بتاؤں آپ کو" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ مسکراتے ہوئے تیکھے ہونٹوں کی محراب میں سے مجھے اس کے دانت نظر آئے جو غیر معمولی طور پر صاف اور چمکیلے تھے۔ وہ بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں اپنی ڈگمگاتی ہوئی آنکھوں کو نہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا "بات یہ ہے کہ پندرہ بیس دن اوپر ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ ۔۔۔۔۔۔"
پہلے تو میں مطلب نہ سمجھا لیکن جب وہ بولتے بولتے رک گئی تو میں کسی قدر سمجھ گیا۔ "ایسا اکثر ہوتا ہے"
اس نے زور سے کش لیا اور مردوں کی طرح زور سے دھوئیں کو باہر نکالتے ہوئے کہا "نہیں۔ یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کچھ ٹھیر نہ گیا ہو"
میں نے کہا "اوہ!"
اس نے سگرٹ کا آخری کش لے کر اس کی گردن چاء کی طشتری میں دبائی "اگر ایسا ہو گیا ہے تو بڑی مصیبت ہو گی۔ ایک دفعہ پشاور میں ایسی ہی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ لیکن عزیز صاحب اپنے ایک حکیم دوست سے ایسی دوا لائے تھے جس سے چند دنوں ہی میں سب صاف ہو گیا تھا"
میں نے پوچھا "آپ کو بچے پسند نہیں؟"
وہ مسکرائی "پسند ہیں ـــــ لیکن کون پالتا پھرے"
میں نے کہا "آپ کو معلوم ہے اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے"
وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ پھر اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔
"مجھ سے عزیز صاحب نے بھی یہی کہا تھا لیکن سعادت صاحب میں

پوچھتی ہوں اس میں جرم کی کون سی بات ہے اپنی ہی تو چیز ہے اور ان قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچہ ضائع کراتے ہوئے تکلیف کتنی ہوتی ہے ——— بڑا جرم ہے ۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا "عجیب وغریب عورت ہو تم جانکی !"

جانکی نے بھی ہنسنا شروع کیا "عزیز صاحب بھی یہی کہا کرتے تھے" ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرا مشاہدہ ہے جو آدمی پرخلوص ہوں، ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آجاتے ہیں۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا اور آنکھیں خشک کرکے بھولے بچوں کے انداز میں پوچھا "سعادت صاحب بتائیے، کیا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں ؟"

میں نے کہا "بہت"

"جھوٹ"

"اس کا ثبوت ؟"

اس نے سگرٹ سلگانا شروع کردیا "بھئی شاید ایسا ہو۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کچھ کچھ بے وقوف ہوں۔ زیادہ کھاتی ہوں، زیادہ بولتی ہوں۔ زیادہ ہنستی ہوں ——— اب آپ ہی دیکھئے نا۔ زیادہ کھانے سے میرا پیٹ کتنا بڑھ گیا ہے۔ عزیز صاحب ہمیشہ کہتے رہے۔ جانکی کم کھایا کرو پر میں نے ان کی ایک نہ سنی ——— سعادت صاحب بات یہ ہے کہ میں کم کھاؤں تو ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے کوئی بات کہنا بھول گئی ہوں"

اس نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ اسکی ہنسی بالکل الگ قسم کی تھی۔ بیچ بیچ میں گھنگھرو سے بجتے تھے۔

پھر وہ اسقاط حمل کے متعلق باتیں شروع کرنے ہی والی تھی کہ میرا دوست

جس کے یہاں میں ٹھیرا ہوا تھا آگیا۔ میں نے جانکی سے اس کا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ وہ فلم لائن میں آنے کا شوق رکھتی ہے۔ میرا دوست اُسے اسٹوڈیو لے گیا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ ڈائرکٹر جس کے ساتھ وہ بحیثیت اسسٹنٹ کے کام کر رہا تھا اپنے نئے فلم میں جانکی کو ایک خاص رول کے لئے ضرور لے لیگا۔

پونہ میں جتنے اسٹوڈیو تھے۔ میں نے مختلف ذرائع سے جانکی کے لئے کوشش کی۔ کسی نے اس کا ساؤنڈ ٹسٹ لیا۔ کسی نے کیمرہ ٹسٹ۔ ایک فلم کمپنی میں اس کو مختلف قسم کے لباس پہنا کر دیکھا گیا۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ایک تو جانکی ویسے ہی دن اوپر ہو جانے کے باعث پریشان تھی۔ چار پانچ روز متواتر جب اُسے مختلف فلم کمپنیوں کے اکتا دینے والے ماحول میں بے نتیجہ گذارنے پڑے تو وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔

بچہ ضائع کرنے کے لئے وہ ہر روز بیس بیس گرین کونین کھاتی تھی۔ اس سے بھی اس کی طبیعت پر گرانی سی رہتی تھی۔ عزیز صاحب کے دن پشاور میں اس کے بغیر کیسے گذرتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی اس کو ہر وقت فکر رہتی تھی۔ پونہ پہنچتے ہی اس نے ایک تار بھیجا تھا۔ اس بعد وہ بلا ناغہ ہر روز ایک خط لکھ رہی تھی ہر خط میں تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتے رہیں۔

عزیز صاحب کو کیا بیماری تھی اس کا مجھے علم نہیں لیکن جانکی سے مجھے اتنا معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کو چونکہ اس سے محبت ہے اس لئے وہ فوراً اس کا کہنا مان لیتے ہیں۔ مگر میں کئی بار بیوی سے ان کا جھگڑا ہوا کہ وہ دوا نہیں پیتے۔ لیکن جانکی سے اس معاملے میں انھوں نے کبھی چوں بھی نہ کی

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکر مند

رہتی ہے محض بکواس ہے۔ بناوٹ ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اُسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے۔ اُسی کا جب بھی خط آیا جانکی پڑھ کے ضرور روئی۔

فلم کمپنیوں کے طواف کا کوئی نتیجہ نہ نکلا لیکن ایک روز جانکی کو یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا اندیشہ غلط تھا۔ دن واقعی اوپر ہو گئے تھے لیکن وہ بات جس کا اُسے کھٹکا تھا نہیں تھی۔

جانکی کو پونہ آئے بیس روز ہو چلے تھے۔ عزیز کو وہ خط پہ خط لکھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے بھی لمبے لمبے محبت نامے آتے تھے۔ ایک خط میں عزیز نے مجھ سے کہا تھا کہ پونہ میں اگر جانکی کے لئے کچھ نہیں ہوتا تو میں بمبے میں کوشش کروں کیونکہ وہاں بے شمار اسٹوڈیو ہیں۔ بات معقول تھی لیکن میں سینریو لکھنے میں مصروف تھا اس لئے جانکی کے ساتھ میرا بمبے جانا بہت مشکل تھا۔ لیکن میں نے پونہ سے اپنے دوست سعید کو جو ایک فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا ٹیلی فون کیا۔ اتفاق سے وہ اس وقت اسٹوڈیو میں موجود نہیں تھا۔ آفس میں نرائن کھڑا تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ میں پونہ سے بول رہا ہوں تو ٹیلی فون لے لیا اور زور سے چلّایا

"ہلو منٹو..... نرائن اسپیکنگ فرام دس اینڈ..... کہو کیا بات ہے سعید اس وقت اسٹوڈیو میں نہیں ہے گھر میں بیٹھا رضیہ سے آخری حساب کتاب کر رہا ہے.....

میں نے پوچھا "کیا مطلب؟"

نرائن نے اُدھر سے جواب دیا "کھٹ پٹ ہو گئی ہے ان میں، رضیہ نے ایک اور آدمی سے ٹانکا ملا لیا ہے"

میں نے کہا "لیکن یہ حساب کتاب کیا ہو رہا ہے۔؟"

نرائن بولا "بڑا کمینہ ہے یار سعید ـــــــ اس سے کپڑے لے رہا ہے جو اس نے خرید کے دیئے تھے ـــــــ خیر چھوڑو اس بات کو، بتاؤ بات کیا ہے؟"

میں نے اس سے کہا "بات یہ ہے کہ پشاور سے میرے ایک عزیز نے ایک عورت یہاں بھیجی ہے جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے"

جانکی میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے مناسب و موزوں لفظوں میں اپنا مدعا بیان نہیں کیا ـــــــ میں تصحیح کرنے ہی والا تھا کہ نرائن کی بلند آواز کانوں کے اندر گھسی ـــــــ "عورت؟ ـــــــ پشاور کی عورت۔ خو بھیجو اس کو جلدی ـــــــ خو ہم بھی قصور کا پٹھان ہے"

میں نے کہا "بکواس نہ کرو نرائن سنو۔ کل دکن کوئن سے میں انہیں بمبے بھیج رہا ہوں۔ سعید یا تم کوئی بھی اُسے اسٹیشن پر لینے کے لئے آجانا ــ کل دکن کوئن سے۔ یاد رکھنا ـ"

نرائن کی آواز آئی "پر ہم اُسے پہچانیں گے کیسے؟"

میں نے جواب دیا "وہ خود تمہیں پہچان لے گی ـــــ لیکن دیکھو کوشش کرکے اُسے کسی نہ کسی جگہ ضرور رکھوا دینا ـ"

تین منٹ گذر گئے۔ میں نے ٹیلی فون بند کیا اور جانکی سے کہا "کل دکن کوئن سے تم بمبے چلی جانا۔ سعید اور نرائن دونوں کی تصویریں میں دکھاتا ہوں۔ لمبے تڑنگے خوبصورت جوان ہیں۔ تمہیں پہچاننے میں دقت نہیں ہوگی"

میں نے البم میں جانکی کو سعید اور نرائن کے مختلف فوٹو دکھائے ـ دیر تک وہ انہیں دیکھتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ سعید کا فوٹو اس نے زیادہ

غور سے دیکھا۔

البم ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالنے کی ڈگمگاتی کوشش کرتے ہوئے اس نے پوچھا "دونوں کیسے آدمی ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دونوں کیسے آدمی ہیں؟ —— میں نے سنا ہے کہ فلموں میں اکثر آدمی بُرے ہوتے ہیں"

اس کے لہجے میں ایک ٹوہ لینے والی سنجیدگی تھی۔

میں نے کہا "یہ تو درست ہے لیکن فلموں میں نیک آدمیوں کی ضرورت ہی کہاں ہوتی ہے"

"کیوں؟"

"دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک قسم اُن انسانوں کی ہے جو اپنے زخموں سے درد کا اندازہ کرتے ہیں دوسری قسم ان کی ہے جو دوسروں کے زخم دیکھ کر درد کا اندازہ کرتے ہیں —— تمہارا کیا خیال ہے کونسی قسم کے انسان زخم کے درد اور اس کی جلن کو صحیح طور پہ محسوس کرتے ہیں"

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا "وہ جن کے زخم لگے ہوتے ہیں"

میں نے کہا "بالکل درست ۔ فلموں میں اصل کی اچھی نقل وہی اتار سکتا ہے جسے اصل سے واقفیت ہو۔ ناکام محبت میں دل کیسے ٹوٹتا ہے۔ یہ ناکام محبت ہی اچھی طرح بتا سکتا ہے۔ وہ عورت جو پانچ وقت جا نماز بچھا کر نماز پڑھتی ہے اور عشق و محبت کو سود کے برابر سمجھتی ہے۔ کیمرے کے سامنے کسی مرد کے ساتھ اظہار محبت کیا خاک کرے گی"

اُس نے پھر سوچا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلم لائن میں داخل

ہونے سے پہلے عورت کو سب چیزیں جاننی چاہئیں۔"

میں نے کہا "یہ ضروری نہیں۔ فلم لائن میں آکر بھی وہ یہ چیزیں جان سکتی ہے۔"

اس نے میری بات پر غور نہ کیا، اور جو پہلا سوال کیا تھا پھر اُسے دُہرایا۔

"سعید صاحب اور نرائن صاحب کیسے آدمی ہیں۔۔؟"

"تم تفصیل سے پوچھنا چاہتی ہو؟"

"تفصیل سے آپ کا کیا مطلب؟"

"یہ کہ دونوں میں سے آپ کے لئے کون بہتر رہے گا؟"

جانکی کو میری یہ بات ناگوار گذری۔

"کیسی بات کرتے ہیں آپ؟"

"جیسی تم چاہتی ہو۔"

"ہٹائیے بھی"۔ یہ کہہ کر وہ مسکرائی "میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جب پوچھو گی تو میں نرائن کی سفارش کروں گا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ سعید کے مقابلے میں بہتر انسان ہے۔"

میرا اب بھی یہی خیال ہے۔ سعید شاعر ہے، ایک بہت بے رحم قسم کا شاعر مرغی پکڑے گا تو ذبح کرنے کے بجائے اس کی گردن مروڑ دے گا۔ گردن مروڑ کر اس کے پر نوچے گا۔ پر نوچنے کے بعد اس کی یخنی نکالے گا یخنی پی کر اور ہڈیاں چبا کر وہ بڑے آرام اور سکون سے ایک کونے میں بیٹھ کر اسی مرغی کی موت پر

ایک نظم لکھے گا جو اس کے آنسوؤں میں بھیگی ہوگی ۔

شراب پیے گا تو کبھی بہکے گا نہیں ۔ مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے ۔ کیونکہ شراب کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے ۔ صبح بہت آہستہ آہستہ بستر پر سے اُٹھے گا ۔ نوکر چائے کی پیالی بنا کر لائے گا ۔ اگر رات کی بچی ہوئی رم سرہانے پڑی ہے تو اسے چائے میں انڈیل لے گا اور اس مکسچر کو ایک ایک گھونٹ کرکے ایسے پیے گا جیسے اس میں ذائقہ کی کوئی حس ہی نہیں ۔

بدن پہ کوئی پھوڑا نکلا ہے ۔ خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے ۔ مگر مجال ہے جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو ۔ پیپ نکل رہی ہے ۔ گل سڑ گیا ہے ۔ ناسور بننے کا خطرہ ہے لیکن سعید کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا آپ اس سے کچھ کہیں گے تو یہ جواب ملے گا "اکثر اوقات بیماریاں انسان کی جزوِ بدن ہو جاتی ہیں ۔ جب مجھے یہ زخم تکلیف نہیں دیتا تو علاج کی کیا ضرورت ہے" اور یہ کہتے ہوئے وہ زخم کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے کوئی بڑا اچھا شعر نظر آگیا ہے ۔

ایکٹنگ وہ ساری عمر نہیں کر سکے گا ۔ اس لئے کہ وہ لطیف جذبات سے قریب عاری ہے ۔ میں نے اسے ایک فلم میں دیکھا جو ہیروئن کے گانوں کے باعث بہت مقبول ہوا تھا ۔ ایک جگہ اسے اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت کا اظہار کرنا تھا ۔ خدا کی قسم اس نے ہیروئن کا ہاتھ کچھ اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا جیسے کتے کا پنجا پکڑا جاتا ہے ۔ میں اس سے کئی بار کہہ چکا ہوں ، ایکٹر بننے کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو ۔ اچھے شاعر ہو ۔ گھر بیٹھو اور نظمیں لکھا کرو ۔ مگر اس کے دماغ پر ابھی تک ایکٹنگ کی دھن سوار ہے ۔

نزاکت مجھے بہت پسند ہے ۔ اسٹوڈیو کی زندگی کے جو اصول اس نے اپنے لئے وضع کر رکھے ہیں مجھے اچھے لگتے ہیں ۔

(۱) ایکٹر جب تک ایکٹر ہے اسے شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ شادی کرے تو فوراً فلم کو طلاق دیکر دودھ دہی کی دکان کھول لے۔ اگر مشہور ایکٹر رہا ہے تو کافی آمدنی ہو جایا کرے گی۔

(۲) کوئی ایکٹرس تمہیں بھیا یا بھائی صاحب کہے تو تم فوراً اس کے کان میں کہو آپ کی انگیا کا کیا سائز ہے؟

(۳) کسی ایکٹریس پر اگر تمہاری طبیعت آگئی ہے تو تمہیدیں باندھنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اس سے تنہائی میں ملو اور کہو "میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں" اس کو یقین نہ آئے تو پوری جیب باہر نکال کر دکھا دو۔

(۴) اگر کوئی ایکٹریس تمہارے حلقے میں آجائے تو اس کی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی نہ لو۔ ایکٹریسوں کے شوہروں اور بھائیوں کے لیے یہ پیسہ حلال ہے

(۵) اس بات کا خیال رکھنا کہ ایکٹریس کے بطن سے تمہاری کوئی اولاد نہ ہو سوراج ملنے کے بعد البتہ تم اس قسم کی اولاد پیدا کر سکتے ہو۔

(۶) یاد رکھو ایکٹر کی بھی عاقبت ہوتی ہے۔ اسے ریزر اور کنگھی سے سنوارنے کے بجائے کبھی کبھی غیر مہذب طریقے سے بھی سنوارنے کی کوشش کیا کرو۔ مثال کے طور پر کوئی نیک کام کرے۔

(۷) اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ احترام پٹھان چوکیدار کا کرو۔ صبح اسٹوڈیو میں آتے وقت اسے سلام کرنے سے تمہیں فائدہ ہوگا۔ یہاں نہیں تو دوسری دنیا میں جہاں فلم کمپنیاں نہیں ہوں گی۔

(۸) شراب اور ایکٹریس کی عادت ہرگز نہ ڈالو۔ بہت ممکن ہے کسی روز کانگریس گورنمنٹ لہر میں آکر یہ دونوں چیزیں ممنوع قرار دیدے۔

(۹) سوداگر، مسلمان سوداگر ہو سکتا ہے لیکن ایکٹر ہندو ایکٹر یا مسلم ایکٹر

نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) جھوٹ نہ بولو۔

یہ سب باتیں "نرائن کے دس احکام" کے عنوان تلے اس نے اپنی ایک نوٹ بک میں لکھ رکھی ہیں جن سے اس کے کیریکٹر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ وہ ان سب پر عمل نہیں کرتا مگر یہ حقیقت نہیں۔

سعید اور نرائن کے متعلق جو میرے خیالات تھے میں نے جانکی کے پوچھے بغیر اشارۃً بتا دیئے اور آخر میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔" اگر تم اس لائن میں آگئیں تو کسی نہ کسی مرد کا سہارا تمہیں لینا ہی پڑے گا۔ نرائن کے متعلق میرا خیال ہے کہ اچھا دوست ثابت ہو گا۔"

میرا مشورہ اس نے سن لیا اور بمبئی چلی گئی۔ دوسرے روز خوش خوش واپس آئی کیونکہ نرائن نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک سال کے لئے پانچ سو روپے ماہوار پر اُسے ملازم کرا دیا تھا۔ یہ ملازمت اُسے کیسے ملی۔ دیر تک اس کے متعلق باتیں ہوئیں۔ جب اور کچھ سننے کو نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا "سعید اور نرائن دونوں سے تمہاری ملاقات ہوئی۔ ان میں سے کس کو تم نے زیادہ پسند کیا؟"

جانکی کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لغزش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا "سعید صاحب کو" یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی "سعادت صاحب آپ نے کیوں اتنے پل باندھے تھے نرائن کی تعریفوں کے؟"

"میں نے پوچھا "کیوں؟"

"بڑا ہی واہیات آدمی ہے ــــ شام کو باہر کرسیاں بچھا کر

سعید صاحب اور وہ شراب پینے کے لئے بیٹھے تو باتوں باتوں میں میں نے نرائن بھیا کہا۔ اپنا منہ میرے کان کے پاس لاکر اس نے مجھ سے پوچھا "تمہاری انگیا کا کیا سائز ہے ؟" بھگوان جانتا ہے میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی ـــــــ کیا لچر آدمی ہے" جانکی کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اس نے تیزی سے کہا "آپ کیوں ہنس رہے ہیں ؟"

" اس کی بیوقوفی پر" یہ کہہ کر میں نے ہنسنا بند کر دیا۔

تھوڑی دیر نرائن کو بُرا بھلا کہنے کے بعد جانکی نے عزیز کے متعلق فکر مند لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔ کئی دنوں سے اس کا خط نہیں آیا تھا۔ اس لئے طرح طرح کے خیال اُسے ستا رہے تھے۔ کہیں انھیں پھر زکام نہ ہو گیا ہو۔ اندھا دھند سائیکل چلاتے ہیں۔ کہیں حادثہ ہی نہ ہو گیا ہو۔ یہ نہ ہی نہ آ رہے ہوں، کیونکہ جانکی کو رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا تھا۔ ایک روز میں چپ چاپ تمہارے پاس چلا آؤں گا۔

باتیں کرنے کے بعد جب اس کا تردد کم ہوا تو اس نے عزیز کی تولفیں شروع کر دیں۔ گھر میں بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہر روز صبح ان کو ورزش کراتے ہیں اور نہلا دھلا کر اسکول چھوڑنے جاتے ہیں۔ بیوی بالکل پھوہڑ ہے اس لئے رشتہ داروں سے سارا رکھ رکھاؤ خود انہیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ جانکی کو ٹائی فائڈ ہو گیا تھا تو بیس دن تک متواتر نرسوں کی طرح اس کی تیمارداری کرتے رہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے روز مناسب و موزوں الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ بمبئی چلی گئی جہاں اس کے لئے ایک نئی اور چمکیلی دنیا کے دروازے

کھل گئے تھے۔

پونہ میں مجھے تقریباً دو مہینے کہانی کا منظرنامہ تیار کرنے میں لگے۔ حق الخدمت وصول کر کے میں نے بمبئی کا رُخ کیا جہاں مجھے ایک نیا کنٹریکٹ مل رہا تھا۔

میں صبح پانچ بجے کے قریب اندھیری پہنچا جہاں ایک معمولی بنگلے میں سعید اور نرائن دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ برآمدے میں داخل ہوا تو دروازہ بند پایا۔ میں نے سوچا سو رہے ہوں گے، تکلیف نہیں دینا چاہئے۔ پچھلی طرف ایک دروازہ ہے جو نوکروں کے لئے اکثر کھلا رہتا ہے میں اس میں سے اندر داخل ہوا۔ باورچی خانہ اور ساتھ والا کمرہ جس میں کھانا کھایا جاتا ہے حسبِ معمول بے حد غلیظ تھا۔ سامنے والا کمرہ مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے ایک پر سعید اور اس کے ساتھ کوئی اور لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔

مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ دوسرے پلنگ پر میں کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا۔ پائنتی پر کمبل پڑا تھا۔ یہ میں نے ٹانگوں پر ڈال لیا۔ سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سعید کے پیچھے سے ایک چوڑیوں والا بازو نکلا اور پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھنے لگا۔ کرسی پر لٹھے کی سفید شلوار لٹک رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا ــــــ سعید کے ساتھ جا کی لیٹی تھی۔ میں نے کرسی پر سے شلوار اٹھائی اور اس کی طرف پھینک دی۔

نرائن کے کمرے میں جا کر میں نے اسے جگایا۔ رات کے دو بجے اس کی شوٹنگ ختم ہوئی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ اس غریب کو جگایا۔

لیکن وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا کسی خاص موضوع پر نہیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر بقول اس کے وہ کچھ بے ہودہ بکواس کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ صبح ۹ بجے تک ہم بے ہودہ بکواس میں مشغول رہے۔ جس میں بار بار جانکی کا بھی ذکر آیا۔

جب میں نے انگیا والی بات چھیڑی تو نرائن بہت ہنسا ہنستے ہنستے اس نے کہا: "سب سے مزے دار بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کان کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا، تمہاری انگیا کا کیا سائز ہے تو اس نے بتا دیا، کہا، چوبیس۔

اس کے بعد اچانک اسے میرے سوال کی بے ہودگی کا احساس ہوا اور مجھے کوسنا شروع کر دیا ـــــ بالکل بچی ہے۔ جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو سینہ پر دوپٹہ کھسکا لیتی ہے لیکن منٹو بڑی وفادار عورت ہے۔"

میں نے پوچھا: "یہ تم نے کیسے جانا؟"

نرائن مسکرایا: "عورت، جو ایک بالکل اجنبی آدمی کو اپنی انگیا کا صحیح سائز بتا دے دھوکے باز ہرگز نہیں ہو سکتی۔"

عجیب و غریب منطق تھی لیکن نرائن نے مجھے بڑی سنجیدگی سے یقین دلایا کہ جانکی بڑی پُرخلوص عورت ہے۔ اس نے کہا: "منٹو تمہیں معلوم نہیں سعید کی کتنی خدمت کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی خبر گیری جو پرلے درجہ کا بے پروا ہو آسان کام نہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ جانکی اس مشکل کو بڑی آسانی سے نبھا رہی ہے ـــــ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پرخلوص اور ایماندار آیا بھی ہے۔ صبح اٹھ کر اس خرذات کو جگانے میں آدھا گھنٹہ صرف کرتی ہے۔ اس کے دانت صاف کراتی ہے۔ کپڑے پہناتی ہے۔ ناشتہ کراتی ہے۔ اور رات کو جب وہ رم پی کر بستر پہ لیٹتا ہے تو سب دروازے بند کر کے اس کے ساتھ لیٹ جاتی ہے ـــــ اور جب اسٹوڈیو میں کسی سے ملتی ہے تو صرف سعید

کی باتیں کرتی ہے۔ سعید صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں، سعید صاحب بہت اچھا لگاتے ہیں۔ سعید صاحب کا وزن بڑھ گیا ہے۔ سعید صاحب کا پل اوور تیار ہو گیا ہے۔ سعید صاحب کے لئے پشاور سے پڑھٹو ہاری سینڈل منگوائی ہے، سعید صاحب کے سر میں آج ہلکا ہلکا درد ہے۔ اسپرو لینے جا رہی ہوں۔ سعید صاحب نے آج مجھ پر ایک شعر کہا —— اور جب مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انگیاوالی بات یاد کرکے تیوری چڑھا لیتی ہے۔"

میں تقریباً دس دن سعید اور نرائن کا مہمان رہا۔ اس دوران میں سعید نے جانکی کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ شاید اس لئے کہ ان کا معاملہ کافی پرانا ہو چکا تھا۔ جانکی سے البتہ کافی باتیں ہوئیں۔ وہ سعید سے بہت خوش تھی۔ لیکن اسے اس کی بے پروا طبیعت کا بہت گلہ تھا۔ "سعادت صاحب اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ بہت بے پروا ہیں۔ ہر وقت سوچنا جو ہوا اس لئے کسی بات کا خیال ہی نہیں رہتا۔ آپ ہنسیں گے۔ لیکن مجھے ہر روز ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ سنڈاس گئے تھے یا نہیں؟"

نرائن نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا ٹھیک نکلا۔ جانکی ہر وقت سعید کی خبر گیری میں منہمک رہتی تھی۔ میں دس دن اندھیری کے بنگلے میں رہا۔ ان دس دنوں میں جانکی کی بے لوث خدمت نے مجھے بہت متاثر کیا لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ عزیز کا کیا ہوا —— جانکی کو اس کا بھی تو بہت خیال رہتا تھا، کیا سعید کو پاکر وہ اس کو بھول چکی تھی۔

میں نے اس سوال کا جواب جانکی ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرتا جس کمپنی سے میرا کنٹریکٹ ہونے والا تھا اس کے مالک سے میری کسی بات پر چخ ہو گئی اور میں دماغی تکدر دور کرنے کے لئے پونہ چلا گیا۔

دو ہی دن گذرے ہوں گے کہ بمبئے سے عزیز کا تار آیا کہ میں آ رہا ہوں ____ پانچ چھ گھنٹے کے بعد وہ میرے پاس تھا۔ اور دوسرے روز صبح سویرے جانکی میرے کمرے پر دستک دے رہی تھی۔

عزیز اور جانکی جب ایک دوسرے سے ملے تو انھوں نے دیر سے بچھڑے ہوئے عاشق و معشوق کی سرگرمی ظاہر نہ کی۔ میرے اور عزیز کے تعلقات شروع سے بہت سنجیدہ اور متین رہے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ دونوں معتدل رہے۔

عزیز کا خیال تھا ہوٹل میں اٹھ جائے لیکن میرا دوست جس کے یہاں میں تھا آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے کولھاپور گیا تھا۔ اس لئے میں نے عزیز اور جانکی کو اپنے پاس ہی رکھا۔ تین کمرے تھے۔ ایک میں جانکی سو سکتی تھی۔ دوسرے میں عزیز۔ یوں تو مجھے اُن دونوں کو ایک ہی کمرہ دینا چاہیئے تھا۔ لیکن عزیز سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس نے جانکی سے اپنے تعلق کو مجھ پر ظاہر بھی نہیں کیا تھا۔

رات کو دونوں سینما دیکھنے چلے گئے۔ میں ساتھ نہ گیا اس لئے کہ میں فلم کے لئے ایک نئی کہانی شروع کرنا چاہتا تھا۔ دو بجے تک میں جاگتا رہا۔ اس کے بعد سو گیا۔ ایک چابی میں نے عزیز کو دے دی تھی اس لئے مجھے ان کی طرف سے اطمینان تھا۔

رات کو میں چاہے بہت دیر تک کام کروں، ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان ایک دفعہ ضرور جاگتا ہوں اور اُٹھ کر پانی پیتا ہوں حسب عادت اس رات کو بھی میں پانی پینے کے لئے اُٹھا۔ اتفاق سے جو کمرہ میرا تھا یعنی جس میں میں نے اپنا بستر جمایا ہوا تھا عزیز کے پاس تھا اور اس میں میری صراحی

پڑی تھی۔

اگر مجھے شدت کی پیاس نہ لگی ہوتی تو عزیز کو تکلیف نہ دیتا، لیکن زیادہ وسکی پینے کے باعث میرا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ اس لئے مجھے دستک دینی ہی پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ جانکی نے آنکھیں ملتے ملتے دروازہ کھولا اور کہا "سعید صاحب!" اور جب مجھے دیکھا تو ایک ہلکی سی "اوہ" اس کے منہ سے نکل گئی۔

اندر پلنگ پر عزیز سو رہا تھا۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ جانکی بھی مسکرائی۔ اور اس کے تیکھے ہونٹ ایک کونے کی طرف سکڑ گئے۔ میں نے پانی کی صراحی لی اور چلا آیا۔

صبح اٹھا تو کمرے میں دھواں جمع تھا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو جانکی کاغذ جلا جلا کر عزیز کے غسل کے لئے پانی گرم کر رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور انگیٹھی میں پھونکیں مارتی ہوئی کہنے لگی "عزیز صاحب ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو انہیں زکام ہو جاتا ہے۔ میں نہیں تھی پشاور میں تو ایک مہینہ بیمار رہے اور رہتے بھی کیوں نہیں جب دوا پینی ہی چھوڑ دی تھی..... ... آپ نے دیکھا نہیں کتنے دبلے ہو گئے ہیں۔"

اور عزیز نہا دھو کر جب کسی کام کی غرض سے باہر گیا تو جانکی نے مجھ سے سعید کے نام تار لکھنے کے لئے کہا "مجھے کل یہاں پہنچتے ہی تار بھیجنا چاہیئے تھا ——— کتنی غلطی ہوئی مجھ سے۔ انہیں بہت تشویش ہو رہی ہو گی۔"

اس نے مجھ سے تار کا مضمون بنوایا جس میں اپنی بخیریت پہنچنے کی اطلاع تو تھی لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا۔ انجکشن لگوانے کی تاکید بھی تھی۔

چار روز گزر گئے۔ سعید کو جانکی نے پانچ تار روانہ کئے پراس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا بمبئے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک شام کو عزیز کی طبیعت خراب ہوگئی۔ مجھ سے سعید کے نام ایک اور تار لکھوا کر وہ ساری رات عزیز کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ معمولی بخار تھا۔ لیکن جانکی کو بے حد تشویش تھی۔ میرا خیال ہے اس تشویش میں سعید کی خاموشی کا پیدا کردہ اضطراب بھی شامل تھا۔ وہ مجھ سے اس دوران میں کئی بار کہہ چکی تھی "سعادت صاحب میرا خیال ہے سعید صاحب ضرور بیمار ہیں ورنہ وہ مجھے میرے تاروں اور خطوں کا جواب ضرور لکھتے"

پانچویں روز شام کو عزیز کی موجودگی میں سعید کا تار آیا جس میں لکھا تھا "میں بہت بیمار ہوں فوراً چلی آؤ" تار آنے سے پہلے جانکی میری کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھی لیکن جب اس نے سعید کی بیماری کی خبر سنی تو ایک دم خاموش ہوگئی —— عزیز کو یہ خاموشی بہت ناگوار معلوم ہوئی کیونکہ جب اس نے جانکی کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ میں اٹھ کر چلا گیا۔

شام کو جب واپس آیا تو جانکی اور عزیز کچھ اس طرح علیحدہ علیحدہ بیٹھے تھے جیسے ان میں کافی جھگڑا ہو چکا ہے۔ جانکی کے گالوں پر آنسوؤں کا میل تھا جب میں کمرے میں داخل ہوا تو اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جانکی نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عزیز سے کہا "میں جاتی ہوں لیکن بہت جلد واپس آجاؤں گی" پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "سعادت صاحب ان کا خیال رکھئے گا۔ ابھی تک بخار دور نہیں ہوا ہے"

میں اسٹیشن تک اس کے ساتھ گیا۔ بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ خرید کر اسے گاڑی میں بٹھا دیا اور گھر چلا آیا۔ عزیز کو ہلکا ہلکا بخار تھا ہم دونوں

دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن جانکی کا ذکر نہ آیا۔

تیسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد جانکی کی۔ جلدی جلدی لفظوں کو اوپر تلے کرتی ہوئی وہ عزیز سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت اب کیسی ہے اور کیا اس کی غیر موجودگی میں اس نے باقاعدہ دوا پی تھی یا نہیں۔ عزیز کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی لیکن آدھے گھنٹے کے بعد جب کہ نیند سے میری آنکھیں مندرہی تھیں عزیز کی خفگی آمیز باتوں کا دباد باشور سنائی دیا۔ سمجھ میں تو کچھ نہ آیا لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ جانکی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

صبح دس بجے عزیز نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور جانکی کا گرم کیا ہوا پانی ویسے ہی غسل خانے میں پڑا رہا۔ جب میں نے جانکی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

نہا دھو کر عزیز باہر چلا گیا۔ جانکی کمرے میں پلنگ پر لیٹی رہی۔ سہ پہر کو تین بجے کے قریب جب میں اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے باہر نکلا تو عزیز اکّے میں اسباب رکھوا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو" تو اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا "بھئی ــــــ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔"

یہ کہہ کر وہ اکّے میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مجھے یہ بتانے کا موقع ہی نہ ملا کہ جانکی کو بہت تیز بخار ہے۔

ڈاکٹر نے جانکی کو اچھی طرح دیکھا اور مجھے بتایا کہ اسے برونکائٹس ہے اگر احتیاط نہ برتی تو نمونیا ہونے کا خطرہ ہے۔ ڈاکٹر نسخہ دیکر چلا گیا تو جانکی نے عزیز کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے نہ بتاؤں لیکن پچھلے

سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ اس لئے میں نے کہہ دیا کہ چلا گیا ہے۔ یہ سُن کر اُسے بہت صدمہ ہوا۔ دیر تک وہ تکئے میں سر دیکر روتی رہی۔

دوسرے روز صبح گیارہ بجے کے قریب جبکہ جانکی کا بخار ایک ڈگری ہلکا تھا اور طبیعت بھی کسی قدر درست تھی۔ بمبیے سے سعید کا تار آیا جس میں بڑے درشت لفظوں میں یہ لکھا تھا "یاد رہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا"۔ میں بہت منع کرتا رہا لیکن وہ تیز بخار ہی میں پونہ ایکسپریس سے بمبیے روانہ ہوگئی۔

پانچ چھ دنوں کے بعد نرائن کا تار آیا "ایک ضروری کام ہے فوراً بمبیے چلے آؤ" میرا خیال تھا کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کنٹریکٹ کی بات کی ہوگی لیکن بمبیے پہنچ کر معلوم ہوا کہ جانکی کی حالت بہت نازک ہے بروانکائٹس بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ پونہ سے بمبیے پہنچی تھی تو اندھیری جانے کے لئے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑی تھی۔ جس کے باعث اس کی دونوں رانیں بہت بری طرح چھل گئی تھیں۔

جانکی نے اس جسمانی تکلیف کو بڑی بہادری سے برداشت کیا۔ لیکن جب وہ اندھیری پہنچی اور سعید نے اس کے بندھے ہوئے اسباب کی طرف اشارہ کرکے کہا "مہربانی کرکے یہاں سے چلی جاؤ" تو اُسے بہت ہی روحانی تکلیف ہوئی۔ نرائن نے مجھے بتایا "سعید کے منہ سے یہ برف جیسے ٹھنڈے لفظ سُن کر وہ ایک لحظے کے لئے بالکل پتھر ہوگئی۔ میرا خیال ہے اس نے تھوڑی دیر کے بعد یہ ضرور سوچا ہوگا کہ میں گاڑی کے نیچے آکر کیوں نہ مرگئی۔ سعادت تم کچھ بھی کہو مگر سعید عورتوں سے جیسا سلوک کرتا ہے بہت ہی نامردانہ ہے —— بے چاری کو بخار تھا۔ چلتی ریل سے گر پڑی تھی اور

وہ بھی اسی خرذات کے پاس جلدی پہنچنے کے باعث —— لیکن اس نے
ان باتوں کا خیال ہی نہ کیا اور ایک بار پھر اس سے کہا، مہربانی کر کے یہاں سے
چلی جاؤ —— اس کے لہجے میں منٹو کسی جذبے کا اظہار نہیں تھا۔
بس ایسا تھا جیسے لنو ٹائپ مشین سے اخبار کی ایک سطر ڈھل کر باہر نکل
آئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا —— شام کو
جب واپس آیا تو جانکی موجود نہیں تھی لیکن سعید پلنگ پر بیٹھا رم کا گلاس
سامنے رکھے ایک نظم لکھنے میں مصروف تھا —— میں نے اس سے کوئی
بات نہ کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا —— دوسرے روز اسٹوڈیو سے
معلوم ہوا کہ جانکی ایک اکسٹرا لڑکی کے گھر خطرناک حالت میں پڑی ہے۔
—— میں نے اسٹوڈیو کے مالک سے بات کی اور اسے ہسپتال بھجوا دیا۔ کل سے
وہیں ہے۔ بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ میں تو اسے دیکھنے جا نہیں سکتا اس لئے
کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے —— تم جاؤ اور دیکھ کر آؤ کس حالت
میں ہے۔"

میں ہسپتال گیا تو اس نے سب سے پہلے عزیز اور سعید کے متعلق پوچھا
جو سلوک ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد اسکے پر خلوص
استفسار نے مجھے بہت متاثر کیا۔

اس کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ دونوں پھیپھڑوں
پر ورم ہے اور جان کا خطرہ ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ جانکی اتنی بڑی
تکلیف مردانہ وار برداشت کر رہی تھی۔

ہسپتال سے لوٹا اور اسٹوڈیو میں نرائن کو تلاش کیا تو معلوم ہوا
وہ صبح ہی سے کہیں غائب ہے۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے مجھے

تین چھوٹی چھوٹی شیشیاں دکھائیں جن کا منہ ربڑ سے بند تھا، جانتے ہو یہ کیا ہے ؟

میں نے کہا " معلوم نہیں ——— انجکشن سے لگتے ہیں "

نرائن مسکرایا " انجکشن ہی ہیں ، لیکن پینسلین کے "

مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ پینسلین اس وقت بہت ہی قلیل مقدار میں تیار ہوتی تھی ۔ امریکہ اور انگلستان میں جتنی بنتی تھی، تھوڑی تھوڑی ملٹری ہسپتالوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی ۔ چنانچہ میں نے نرائن سے پوچھا " یہ تو بالکل نایاب چیز ہے ، تمہیں کیسے مل گئی ؟ "

اس نے مسکرا کر جواب دیا " بچپن میں گھر کی تجوری کھول کر روپے چرانا میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا ——— آج دائیں ہاتھ سے ملٹری ہسپتال کا ریفریجریٹر کھول کر میں نے یہ تین بلب چرائے ہیں ...... چلو جلدی کرو جانکی کو ہسپتال سے ہوٹل میں لے چلیں ۔ "

ٹیکسی لے کر میں ہسپتال گیا اور جانکی کو اس ہوٹل میں لے گیا جس میں نرائن دو کمروں کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا ۔

جانکی نے مجھ سے کئی بار نحیف آواز میں پوچھا کہ میں اسے ہوٹل میں کیوں لایا " ہر بار میں نے یہی جواب دیا " تمہیں معلوم ہو جائے گا "

اور جب اسے معلوم ہوا ، یعنی جب نرائن سرنج ہاتھ میں لئے اسے ٹیکہ لگانے کے لئے اس کمرے میں آیا تو اس نے نفرت سے ایک طرف منہ پھیر لیا ۔ اور مجھ سے کہا " سعادت صاحب اس سے کہئے چلا جائے یہاں سے "

نرائن مسکرایا " جانِ من غصہ تھوک دو ——— یہاں تمہاری جان کا سوال ہے "

جانکی کو طیش آگیا۔ نقاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی "یہ سعادت صاحب
میں جاتی ہوں یہاں سے۔ یا آپ اس حرامزادے کو نکالئے باہر۔"
نرائن نے دھکا دیکر اسے لٹا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔
"یہ حرامزادہ تمہیں انجکشن لگا کر ہی رہے گا —— خبردار جو تم نے
مزاحمت کی۔"
یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ جانکی کا بازو پکڑا۔ سرنج مجھے
دے کر اس نے اسپرٹ میں روئی بھگوئی اور اس کا ڈنڑ صاف کیا۔ اس کے بعد
روئی مجھے دے کر اس نے سرنج کی سوئی اس کے بازو کی مچھلی میں داخل کر دی۔
وہ چیخی، لیکن پنسلین اس کے جسم میں جا چکی تھی۔
جب نرائن نے جانکی کا بازو اپنی مضبوط گرفت سے علیحدہ کیا تو اس نے
رونا شروع کر دیا۔ نرائن نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور اسپرٹ لگی روئی سے
انجکشن والا حصہ پونچھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔
پہلا انجکشن رات کے نو بجے دیا تھا۔ دوسرا تین گھنٹے کے بعد دینا تھا۔
نرائن نے مجھے بتایا اگر تین کے ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے تو پنسلین کا اثر بالکل
زائل ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ جاگتا رہا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس نے
اسٹوو جلایا، سرنج ابالی اور اس میں دوا بھری۔
جانکی خرخراہٹ بھرے سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ نرائن نے
دوسرے بازو کو اسپرٹ سے صاف کیا اور سرنج کی سوئی اندر گھبو دی۔ جانکی
کے ہونٹوں سے پتلی سی چیخ نکلی۔ نرائن نے دوا جسم کے اندر بھیج کر سوئی باہر نکالی
اور اسپرٹ سے انجکشن والی جگہ صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا "اب تیسرا
تین بجے۔"

مجھے معلوم نہیں اس نے تیسرا اور چوتھا انجکشن کب دیا۔ لیکن جب بیدار ہوا تو اسٹوو جلنے کی آواز آرہی تھی۔ اور نرائن ہوٹل کے بیرے سے برف کے لئے کہہ رہا تھا کیونکہ اُسے پنسلین کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔

نو بجے پانچواں انجکشن دینے کے لئے جب ہم دونوں جانکی کے کمرے میں گئے تو وہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے نرائن کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ نرائن مسکرایا "کیوں جانِ من کیا حال ہے؟"

جانکی خاموش رہی۔

نرائن اس کے پاس کھڑا ہو گیا "یہ انجکشن جو تمہیں میں دے رہا ہوں عشق کے انجکشن نہیں۔ تمہارا نمونیہ دور کرنے کے انجکشن ہیں جو میں نے ملٹری ہوسپٹل سے بڑی صفائی کے ساتھ چرائے ہیں —— لو اب ذرا اُلٹی لیٹ جاؤ اور کولھے پر سے شلوار کو ذرا نیچے کھسکا دو —— کبھی لیا ہے یہاں انجکشن؟"

یہ کہکر اس نے جانکی کے کولھے پر ایک جگہ گوشت کے اندر انگلی کھبوئی جانکی کی آنکھوں میں مرعوب سی نفرت پیدا ہوئی۔

جب اس نے کروٹ بدلی تو نرائن نے کہا "شاباش"

پیشتر اس کے کہ جانکی کوئی مزاحمت کرے نرائن نے ایک ہاتھ سے اس کی شلوار نیچے کھسکائی اور مجھ سے کہا "اسپرٹ لگاؤ"

جانکی نے ٹانگیں چلانا شروع کیں تو نرائن نے کہا "جانکی ٹانگیں وانگیں مت چلاؤ —— میں انجکشن لگا کے رہوں گا"

غرضیکہ پانچواں انجکشن دیدیا گیا۔ پندرہ اور باقی تھے جو نرائن کو ہر تین گھنٹے کے بعد دینے تھے۔ اور یہ پینتالیس گھنٹے کا کام تھا۔

پانچ انجکشنوں سے گو جانکی کو بظاہر کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچا تھا لیکن نرائن کو پینسلین کے اعجاز کا یقین تھا۔ اور اُسے پوری پوری امید تھی کہ وہ بچ جائے گی۔ ہم دونوں بہت دیر تک اس نئی دوا کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب نرائن کا نوکر میرے نام ایک تار لے کر آیا۔ پونہ سے تھا۔ ایک فلم کمپنی نے مجھے فوراً بلایا تھا اس لئے مجھے جانا پڑا۔

دس پندرہ دنوں کے بعد کمپنی ہی کے کام سے میں بمبئی آیا۔ کام ختم کر کے جب میں اندھیری پہنچا تو سعید سے معلوم ہوا کہ نرائن ابھی تک ہوٹل ہی میں ہے۔ ہوٹل بہت دور شہر میں تھا اس لئے رات میں وہیں اندھیری میں رہا۔

صبح آٹھ بجے وہاں پہنچا تو نرائن کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرہ خالی پایا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا تو ایک دم آنکھوں کے سامنے آیا۔ جانکی مجھے دیکھتے ہی لحاف کے اندر گھس گئی اور نرائن نے جو اس کے پاس بیٹھا تھا۔ مجھے واپس جاتے دیکھ کر کہا "آؤ منٹو آؤ ـــــ میں ہمیشہ دروازہ بند کرنا بھول جاتا ہوں ـــــ آؤ یار آؤ ـــــ بیٹھو اس کرسی پر۔ جانکی کی شلوار دے دینا۔"

~ ؛ ~

پانچ دن

جموں توی کے راستے کشمیر جائیے۔ تو کُد کے آگے ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں بٹوت آتا ہے۔ بڑی پُر فضا جگہ ہے۔ یہاں دق کے مریضوں کے لئے ایک چھوٹا سا سینے ٹوریم ہے۔ یوں تو آج سے آٹھ نو برس پہلے بٹوت میں پورے تین مہینے گزار چکا ہوں۔ اور اس صحت افزا مقام سے میری جوانی کا ایک ناپختہ رومان بھی وابستہ ہے۔ مگر اس کہانی سے میری کسی بھی کمزوری کا تعلق نہیں۔

چھ سات مہینے ہوئے بٹوت میں اپنے ایک دوست کی بیوی کو دیکھنے کے لئے جانا پڑا جو وہاں سینی ٹوریم میں زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ایک مریض چل بسا اور بیچاری پدما کے سانس جو پہلے ہی اکھڑے ہوئے تھے اور بھی غیر یقینی ہو گئے۔ میں نہیں کہہ سکتا وجہ کیا تھی۔

..... ہر طرف خوبصورتی تھی...... ایک پُر اعتماد خوبصورتی جیسے کسی چور کا کھٹکا نہیں تھا۔

میں سیر سے لوٹ کر سینی ٹوریم میں داخل ہوا تو مریضوں کے اُترے ہوئے چہروں ہی سے مجھے معلوم ہو گیا کہ ایک اور عدد چل بسا ہے.... گیارہ نمبر یعنی پدما۔

اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں جو کھلی رہ گئی تھیں۔ میں نے بہت سے خوفزدہ "کیوں" اور ان کے پیچھے بے شمار "ڈرپوک نہیں" منجمد پائے.... بے چاری!!

پانی برس رہا تھا اس لیے خشک ایندھن جمع کرنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال اس غریب کی لاش کو آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ میرا دوست وہیں چتا کے پاس بیٹھا رہا۔ اور میں اس کا سامان ٹھیک کرنے کے لیے سینی ٹوریم آ گیا...... اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے پھر اس بنگالی عورت کی آواز آئی۔

"بہت دیر لگ گئی آپ کو۔"

"جی ہاں بارش کی وجہ سے خشک ایندھن نہیں مل رہا تھا۔ اس لیے دیر ہو گئی۔"

"اور جگہوں پر تو ایندھن کی دکانیں ہوتی ہیں۔ پر میں نے سنا ہے یہاں اِدھر اُدھر سے خود ہی لکڑیاں کاٹنا اور چننی پڑتی ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"ذرا بیٹھ جائیے۔"

میں اس کے پاس اسٹول پر بیٹھ گیا تو اس نے ایک عجیب سوال کیا۔

"تلاش کرتے کرتے جب آپ کو خشک لکڑی کا ٹکڑا مل جاتا ہوگا تو آپ بہت خوش ہوتے ہوں گے۔"

اس نے میرے جواب کا انتظار نہ کیا۔ اور اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔" موت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے کئی بار سوچا ہے لیکن سمجھ نہیں سکا۔"

وہ داناؤں کی طرح مسکرائی اور بچوں کے سے انداز میں کہنے لگی "میں کچھ کچھ سمجھ سکی ہوں...... اس لئے کہ بہت موتیں دیکھ چکی ہوں...... اتنی کہ آپ شاید ہزاروں برس بھی زندہ رہ کر نہ دیکھ سکیں...... میں بنگال کی رہنے والی ہوں جہاں کا ایک قحط آج کل بہت مشہور ہے..... آپ کو تو پتہ ہی ہوگا۔ لاکھوں آدمی وہاں مر چکے ہیں...... بہت سی کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ سینکڑوں مضمون لکھے جا چکے ہیں۔ پھر بھی سنا ہے کہ انسان کی اس بپتا کا اچھی طرح نقشہ نہیں کھینچا جا سکا...... موت کی اس منڈی میں موت کے متعلق میں نے سوچا۔"

میں نے پوچھا "کیا؟"

اس نے اسی انداز سے جواب دیا "میں نے سوچا کہ ایک آدمی کا مرنا موت ہے...... ایک لاکھ آدمیوں کا مرنا تماشا ہے...... سچ کہتی ہوں موت کا وہ خوف جو کبھی میرے دل پر ہوا کرتا تھا۔ بالکل دور ہو گیا ہے...... ہر بازار میں دس بیس ارتھیاں اور جنازے نظر آئیں۔ تو کیا موت کا اصلی مطلب فوت نہیں ہو جائے گا؟.... میں صرف اتنا سمجھ سکی ہوں کہ ایسی بے تحاشا موتوں پر رونا بیکار ہے...... بیوقوفی ہے...... اول تو اتنے آدمیوں کا مرنا ہی سب سے بڑی حماقت ہے!"

"میں نے فوراً ہی پوچھا "کس کی؟"

"کسی کی بھی ہو..... حماقت حماقت ہے..... ایک بھرے شہر پر آپ اوپر سے بم گرا دیجیئے..... لوگ مر جائیں گے۔ کنوؤں میں زہر ڈال دیجیئے

.... جو بھی ان کا پانی پئے گا۔ مرجائے گا...... یہ کال، قحط، جنگ اور بیماریاں سب واہیات ہیں...... ان سے مرجانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اوپر سے چھت آ گرے۔ لیکن دل کی ایک جائز خواہش کی موت بہت بڑی موت ہے...... انسان کو مارنا کچھ نہیں۔ لیکن اس کی فطرت کو ہلاک کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے چپ ہو گئی لیکن پھر کروٹ بدل کر کہنے لگی۔ "میرے خیالات پہلے ایسے نہیں تھے۔ سچ پوچھئے۔ تو مجھے سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ لیکن اس قحط نے مجھے ایک بالکل نئی دنیا میں پھینک دیا۔" رک کر ایک دم وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ میں اپنی کاپی میں یادداشت کے طور پر اس کی چند باتیں نوٹ کر رہا تھا۔

"یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں۔"

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور کہا "میں افسانہ نگار ہوں.... جو باتیں مجھے دلچسپ معلوم ہوں۔ نوٹ کر لیتا ہوں۔"

"اوہ —— تو پھر میں آپ کو اپنی پوری کہانی سناؤں گی۔"

تین گھنٹے تک نحیف آواز میں وہ مجھے اپنی کہانی سناتی رہی۔ میں اب اپنے الفاظ میں اسے بیان کرتا ہوں، غیر ضروری تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بنگال میں جب قحط پھیلا۔ اور لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگے تو سکینہ کو اس کے چچا نے ایک اوباش آدمی کے پاس پانسو روپے میں بیچ دیا وہ اسے لاہور لے آیا اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا کر اس سے روپیہ کمانے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلا آدمی جو اس کے پاس اس غرض سے لایا گیا ایک خوبصورت اور تندرست نوجوان تھا۔ قحط سے پہلے جب روٹی کپڑے کی فکر نہیں تھی

وہ ایسے ہی نوجوان کے خواب دیکھا کرتی تھی جو اس کا شوہر بنے۔ مگر یہاں اس کا سودا کیا جا رہا تھا۔ ایک ایسے فعل کے لئے اسے مجبور کیا جا رہا تھا جس کے تصور ہی سے وہ کانپ اٹھتی تھی۔

جب وہ کلکتے سے لاہور لائی گئی تو اسے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ وہ باشعور لڑکی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ چند ہی روز میں اسے ایک سکہ بنا کر جگہ جگہ بھنایا جائے گا۔ اس کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ لیکن اس قیدی کی طرح جو رحم کی امید نہ ہونے پر بھی آس لگائے رہتا ہے، وہ کسی ناممکن حادثے کی متوقع تھی......... یہ حادثہ تو نہ ہوا۔ لیکن خود اس میں اتنی ہمّت پیدا ہو گئی کہ وہ اس رات کو کچھ اپنی ہوشیاری سے اور کچھ اس نوجوان کی خامکاری کی بدولت ہوٹل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

اب لاہور کی سڑکیں تھیں اور ان کے نئے خطرے۔ قدم قدم پر ایسا لگتا تھا کہ لوگوں کی نظریں اسے کھا جائیں گی۔ لوگ اسے کم دیکھتے تھے۔ لیکن اس کی جوانی کو جو چھپنے والی چیز نہیں تھی۔ کچھ اتنا زیادہ گھورتے تھے۔ جیسے برمے سے اس کے اندر سوراخ کر رہے ہیں۔ سونے چاندی کا کوئی زیور یا موتی ہوتا۔ تو وہ شاید لوگوں کی نظروں سے بچا لیتی۔ مگر وہ ایک ایسی چیز کی حفاظت کر رہی تھی جس پر کوئی بھی آسانی کے ساتھ ہاتھ مار سکتا تھا۔

تین دن اور تین راتیں، وہ کبھی اِدھر کبھی اُدھر گھومتی بھٹکتی رہی۔ بھوک کے مارے اس کا بُرا حال تھا مگر اس نے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ اس کا یہ پھیلا ہوا ہاتھ اس کی عصمت سمیت کسی اندھیری کوٹھری میں کھینچ لیا جائے گا۔ دکانوں میں سجی ہوئی مٹھائیاں دیکھتی تھی۔ بھٹیار خانوں میں لوگ بڑے بڑے نوالے اٹھاتے تھے اس کے ہر طرف کھانے پینے کی چیزوں کا بڑی

بیدردی سے استعمال ہوتا تھا...... لیکن جیسے دنیا میں اس کے مقسوم کا کوئی دانہ ہی نہیں رہا تھا۔

اسے زندگی میں پہلی بار کھانے کی اہمیت معلوم ہوئی۔ پہلے اس کو کھانا ملتا تھا اور اب وہ کھانے سے ملنا چاہتی تھی۔ اور مل نہیں سکتی تھی۔ چار روز کے فاقوں نے اسے اپنی ہی نظروں میں ایک بہت بڑا شہید تو بنا دیا لیکن اس کے جسم کی ساری بنیادیں ہل گئیں۔ وہ جو روحانی تسکین ہوتی ہے۔ ایک وقت آگیا کہ وہ بھی سکڑنے لگی۔

چوتھے روز شام کو ایک گلی میں سے گذر رہی تھی۔ جانے کیا جی میں آئی کہ ایک مکان کے اندر گھس گئی۔ اندر چل کر خیال آیا کہ نہیں۔ کوئی پکڑے گا...... اور تمام کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ اب اس میں اتنی طاقت بھی تو نہیں...... لیکن سوچتے سوچتے وہ صحن کے پاس پہنچ چکی تھی ...... ملگجے اندھیرے میں اس نے گھڑونچیوں پر دو صاف گھڑے رکھے دیکھے۔ اور ان کے ساتھ ہی پھلوں سے بھرے ہوئے دو تھال...... سیب...... ناشپاتی...... انار...... اس نے سوچا انار بواسیر ہے...... سیب اور ناشپاتیاں ٹھیک ہیں...... گھڑے کے اوپر چپنی کے بجائے ایک پیالہ پڑا تھا۔ اس نے طشتری اٹھا کر دیکھا تو ملائی سے پُر تھا...... اس نے اٹھا لیا اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ سوچ سکے جلدی جلدی اس نے نوالے اٹھانے شروع کئے۔ ساری ملائی اس کے پیٹ میں تھی۔ کتنا راحت بخش لمحہ تھا بھول گئی کہ کسی غیر کے مکان میں ہے...... وہیں بیٹھ کر اس نے سیب اور ناشپاتیاں کھانا شروع کر دیں...... گھڑونچی کے نیچے کچھ اور بھی تھا...... یخنی...... ٹھنڈی تھی۔ لیکن اس نے ساری پتیلی ختم کر دی...... ایک دم جانے کیا ہوا۔ پیٹ کی گہرائیوں سے غبار سا اٹھا اور اس کا سر چکرانے لگا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ کہیں سے کھانسی کی آواز آئی ۔ بھاگنے کی کوشش کی مگر چکرا کر گری اور بے ہوش ہوگئی ۔

جب ہوش آیا تو وہ ایک صاف ستھرے بستر پر لیٹی ہوئی تھی ۔ سب سے پہلے اُسے خیال آیا کہ کہیں میں لٹ تو نہیں گئی ...... لیکن فوراً ہی اُسے اطمینان ہوگیا کہ وہ صحیح سلامت تھی ...... کچھ اور سوچنے ہی لگی تھی کہ پتلی پتلی کھانسی کی آواز آئی ۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ کمرے میں داخل ہوا ۔

سکینہ نے اپنے گاؤں میں بہت سے قحط کے مارے انسان دیکھے تھے ۔ مگر یہ انسان ان سے بہت مختلف تھا ۔ بے چارگی اس کی آنکھوں میں تھی ۔ مگر اس میں وہ اناج کی ترسی ہوئی خواہش نہیں تھی ۔ اس نے پیٹ کے بھوکے دیکھے تھے ۔ جن کی نگاہوں میں ایک ننگی اور بھونڈی للچاہٹ تھی لیکن اس مرد کی نگاہوں میں اُسے ایک چلمن سی نظر آئی ...... ایک دھندلا پردہ جس کے پیچھے سے وہ ڈر ڈر کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا ۔

خوفزدہ سکینہ کو ہونا چاہیئے تھا لیکن سہما ہوا وہ تھا ...... اس نے رک رک کر، کچھ جھینپتے، کچھ عجیب قسم کا حجاب محسوس کرتے ہوئے اس سے کہا ۔

" جب تم کھا رہی تھیں تو میں تم سے کچھ دور کھڑا تھا ...... اُف ! میں نے کن مشکلوں سے اپنی کھانسی روکے رکھی ۔ کہ تم آرام سے کھا سکو ۔ اور میں یہ خوبصورت منظر زیادہ دیر تک دیکھ سکوں ۔ بھوک بڑی پیاری چیز ہے ۔ لیکن ایک میں ہوں کہ اس نعمت سے محروم ہوں ...... نہیں ...... محروم نہیں کہنا چاہیئے ۔ کیونکہ میں نے خود اس کو ہلاک کیا ہے ۔ "

سکینہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی ...... وہ ایک پہیلی تھی جو بوجھتے بوجھتے ایک اور پہیلی بن جاتی تھی ۔ لیکن اس کے باوجود سکینہ کو اسکی باتیں اچھی لگیں ۔

جن میں انسانیت کی گرمی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ساری آپ بیتی اس کو سنادی
وہ خاموش سنتا رہا۔ جیسے اس پر اثر ہی نہیں ہوا۔ لیکن جب سکینہ اس کا
شکریہ ادا کرنے لگی۔ تو اس کی آنکھیں جو آنسوؤں سے بے نیاز معلوم ہوتی
تھیں۔ ایک دم نمناک ہو گئیں اور اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔
"نہیں رہ جاؤ سکینہ...... میں دق کا بیمار ہوں.... مجھے کوئی کھانا۔
.... کوئی پھل اچھا نہیں لگتا۔ تم کھایا کرنا اور میں تمہیں دیکھا کروں گا....."
لیکن فوراً ہی وہ مسکرانے لگا "کیا حماقت ہے..... کوئی اور سنتا تو کیا
کہتا..... یعنی دوسرا کھایا کرے اور میں دیکھا کروں.... نہیں سکینہ۔۔
ویسے میری دلی خواہش ہے کہ تم یہیں رہو......"
سکینہ کچھ سوچنے لگی "جی نہیں..... میرا مطلب ہے آپ
اس گھر میں اکیلے ہیں، اور میں...... نہیں نہیں.... بات یہ ہے کہ میں.."
یہ سن کر اس کو کچھ ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے بالکل
کھو سا گیا۔ جب بولا تو اس کی آواز کھوکھلی تھی "میں دس برس تک اسکول
میں لڑکیاں پڑھاتا رہا ہوں۔ ہمیشہ میں نے ان کو اپنی بچیاں سمجھا.... تم
.... تم ایک اور ہو جاؤ گی"
سکینہ کے لئے کوئی اور جگہ ہی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ اس پروفیسر کے
ہاں ٹھہر گئی۔

وہ ایک برس اور چند مہینے زندہ رہا۔ اس دوران میں بجائے اس کے
کہ سکینہ اس کی خبر گیری کرتی۔ الٹا وہ جو کہ بیمار تھا اس کو آسائش و
آرام پہنچانے میں کچھ اس بے کلی سے مصروف رہا جیسے ڈاک جانے والی ہے
اور وہ جلدی جلدی ایک خط میں جو بات اس کے ذہن میں آتی ہے

لکھتا چلا جا رہا ہے......

اس کی اس توجہ سے سکینہ کو جسے توجہ کی ضرورت تھی۔ چند مہینوں ہی میں نکھار دیا۔ اب پروفیسر اس سے کچھ دور رہنے لگا۔ مگر اس کی توجہ میں کوئی فرق نہ آیا۔

آخری دنوں میں اچانک اس کی حالت خراب ہو گئی۔ ایک رات جبکہ سکینہ اس کے پاس ہی سو رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا اور زور زور سے چلانے لگا "سکینہ سکینہ"

چیخیں سن کر سکینہ گھبرا گئی۔ پروفیسر کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں وہ جو چلمن سی ہوا کرتی تھی۔ موجود نہیں تھی۔ اب ایک اتھاہ دکھ سکینہ کو ان میں نظر آیا...... پروفیسر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سکینہ کے ہاتھ پکڑے اور کہا "میں مر رہا ہوں...... لیکن اس موت کا مجھے دکھ نہیں...... کیونکہ بہت سی موتیں میرے اندر واقع ہو چکی ہیں۔ تم سننا چاہتی ہو میری داستان...... جاننا چاہتی ہو میں کیا ہوں؟...... سنو...... میں ایک جھوٹ ہوں...... بہت بڑا جھوٹ...... میری ساری زندگی اپنے آپ سے جھوٹ بولنے اور پھر اسے سچ بنانے میں گزری ہے...... اُف کتنا تکلیف دہ، غیر فطری اور غیر انسانی کام تھا...... میں نے ایک خواہش کو مارا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس قتل کے بعد مجھے اور بہت سے خون کرنے پڑیں گے۔ میں سمجھتا تھا کہ ایک مسام بند کر دینے سے کیا ہو گا۔ لیکن مجھے اس کی خبر نہیں تھی کہ مجھے اپنے جسم کے سارے دروازے بند کر دینے پڑیں گے...... سکینہ! یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں فلسفیانہ بکواس ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ میں اپنا کیریکٹر اونچا کرتا رہا اور خود انتہائی پستیوں

ے دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ میں مر جاؤں گا اور یہ کیریکٹر ...... بے رنگ پھریرا میری خاک پر اڑتا رہے گا .... وہ تمام لڑکیاں جنہیں میں اسکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ کبھی مجھے یاد کریں گی تو کہیں گی ایک فرشتہ تھا جو انسانوں میں چلا آیا تھا۔ تم بھی میری نیکیوں کو نہیں بھولو گی .... لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سے تم اس گھر میں آئی ہو .... ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا۔ جب میں نے تمہاری جوانی کو دزدیدہ نگاہوں سے نہ دیکھا ہو۔ میں نے تصور میں کئی بار تمہارے ہونٹوں کو چوما ہے ...... کئی بار میں نے تمہارے بازوؤں پر اپنا سر رکھا ہے ...... لیکن ہر بار مجھے ان تصویروں کو پرزے پرزے کرنا پڑا .... پھر ان پرزوں کو جلا کر میں نے راکھ بنائی۔ کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے .... میں مر جاؤں گا ...... کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ اپنے اس اونچے کیریکٹر کو ایک لمبے بانس پر لنگوری کی طرح بٹھا دیتا اور ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو اکٹھا کرتا کہ آؤ دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔ ..."

اس واقعہ کے بعد پروفیسر صرف پانچ روز زندہ رہا ..... سکینہ کا بیان ہے کہ مرنے سے پہلے وہ بہت خوش تھا۔ جب وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ تو اس نے سکینہ سے صرف اتنا کہا "سکینہ، میں لالچی نہیں ..... زندگی کے یہ آخری پانچ دن میرے لیے بہشت ہیں .... میں تمہارا شکرگذار ہوں"

--- ☆ ---

۷۸۶

کتبہ

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔
اُس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری
کے سارے اسرار و رموز دفن
ہیں ۔۔ وہ اب بھی منوں مٹی
کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ
نگار ہے یا خدا

سعادت حسن منٹو

۱۸ اگست ۱۹۵۴ء